شذرات

قربانی	جاوید احمد غامدی	۲
اسلامی نظریاتی کونسل کا کردار	جاوید احمد غامدی/منظور الحسن	۸

قرآنیات

آل عمران (۳: ۱۴۴۔۱۵۱)	جاوید احمد غامدی	۱۱

معارف نبوی

کسی آدمی پر کفر کا الزام لگانا	معز امجد	۱۵
توحید اور نجات	طالب محسن	۱۸

دین و دانش

ایمانیات	جاوید احمد غامدی	۲۵

نقطۂ نظر

مسجد اور عورت امام ابن حزم کا مسلک	پروفیسر خورشید عالم	۲۹

سیر و سوانح

مرکز توحید کی تعمیر اور دعائے ابراہیم	خالد مسعود	۳۷
سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا	محمد وسیم اختر مفتی	۴۹

حالات و وقائع

''مسلم ریاست جدید کیسے بنے؟''	جاوید احمد غامدی/محمد یاسر عرفات	۵۷

یسئلون

متفرق سوالات	جاوید احمد غامدی/معظم صفدر	۶۵

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

جاوید احمد غامدی

قربانی

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا، لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ، فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ، فَلَهٗٓ اَسْلِمُوْا وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ. (الحج ۲۲:۳۴)

''اور ہر امت کے لیے ہم نے قربانی کی عبادت مقرر کی ہے تاکہ وہ اُن چوپایوں پر اللہ کا نام لیں جو اُس نے اُن کو بخشے ہیں، اس لیے کہ تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے تو اپنے آپ کو اسی کے حوالے کر دو۔ (لیکن یہ وہی کریں گے جن کے دل اپنے پروردگار کے آگے جھکے ہوئے ہیں) اور (اے پیغمبر) اِن جھکنے والوں کو (اُن کے پروردگار کی طرف سے) خوش خبری دو۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

دنیا کے تمام قدیم مذاہب میں قربانی اللہ تعالیٰ کے تقرب کا ایک بڑا ذریعہ رہی ہے۔ اس کی حقیقت وہی ہے جو زکوٰۃ کی ہے، لیکن یہ اصلاً مال کی نہیں، بلکہ جان کی نذر ہے جو اس جانور کے بدلے میں چھڑا لی جاتی ہے جسے ہم اس کا قائم مقام بنا کر قربان کرتے ہیں۔ بظاہر یہ اپنے آپ کو موت کے لیے پیش کرنا ہے، لیکن غور کیجیے تو یہ موت ہی حقیقی زندگی کا دروازہ ہے۔ ارشاد فرمایا ہے: وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ، بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ[1]، (اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں، انھیں مردہ نہ کہو۔ وہ مردہ نہیں، بلکہ زندہ ہیں، لیکن تم اس زندگی کی حقیقت نہیں سمجھتے)۔ قرآن نے ایک جگہ نماز کے مقابل میں زندگی اور قربانی کے مقابل میں موت کو رکھ کر یہی حقیقت واضح کی ہے کہ نماز جس طرح اللہ کے ساتھ ہماری زندگی ہے، اسی طرح قربانی اس کی راہ میں ہماری موت ہے:

---

[1] البقرہ ۲:۱۵۴۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ. (الانعام ۶:۱۶۲)

''کہہ دو کہ میری نماز اور میری قربانی، اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ رب العٰلمین کے لیے ہے۔''

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو جب یہ ہدایت کی گئی کہ وہ بیٹے کی جگہ ایک مینڈھے کی قربانی دیں اور آیندہ نسلوں میں ہمیشہ کے لیے ایک عظیم قربانی کو اس کی یادگار بنا دیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: 'وَفَدَیْنٰہُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ'[۲] (اور ہم نے اسمٰعیل کو ایک ذبح عظیم کے عوض چھڑا لیا)۔ اس کے معنی یہ تھے کہ ابراہیم کی یہ نذر قبول کر لی گئی ہے اور اب نسلاً بعد نسلٍ لوگ اپنی قربانیوں کے ذریعے سے اس واقعے کی یاد قائم رکھیں گے۔

اس لحاظ سے دیکھیے تو قربانی پرستش کا منتہاے کمال ہے۔ اپنا اور اپنے جانور کا منہ قبلہ کی طرف کر کے 'بِسْمِ اللّٰہِ، وَاللّٰہُ اَکْبَرُ' کہہ کر،[۳] ہم اپنے جانوروں کو قیام یا سجدے کی حالت میں[۴] اس احساس کے ساتھ اپنے پروردگار کی نذر کر دیتے ہیں کہ یہ درحقیقت ہم اپنے آپ کو اس کی نذر کر رہے ہیں۔

یہی نذر اسلام کی حقیقت ہے، اس لیے کہ اسلام کے معنی ہی یہ ہیں کہ سر اطاعت جھکا دیا جائے اور آدمی اپنی عزیز سے عزیز متاع، حتیٰ کہ اپنی جان بھی اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دے۔ قربانی، اگر غور کیجیے تو اسی حقیقت کی تصویر ہے۔ سیدنا ابراہیم اور ان کے جلیل القدر فرزند نے جب اپنے آپ کو اس کے لیے پیش کیا تو قرآن نے اسے اسلام ہی سے تعبیر کیا ہے: 'فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّہٗ لِلْجَبِیْنِ'[۵] (پھر جب ان دونوں نے اپنے آپ کو حوالے کر دیا اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا)۔ سورۂ حج کی جو آیت اوپر نقل ہوئی ہے، اس میں بھی دیکھ لیجیے 'فلہ اسلموا وبشر المخبتین' کے الفاظ میں قرآن نے کس خوبی کے ساتھ اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یعنی تمھارے دل اگر اپنے معبود کے سامنے جھکے ہوئے ہیں تو اپنے آپ کو اسی کے حوالے کر دو، اس لیے کہ تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے۔ قربانی کی روح یہی ہے اور اللہ تعالیٰ نے یہ عبادت خاص اپنی شکر گزاری کے لیے مشروع فرمائی ہے، لہٰذا اس میں کسی دوسرے کو اس کا شریک نہ بناؤ۔

قربانی کی تاریخ

قربانی کی تاریخ سیدنا آدم علیہ السلام سے شروع ہوتی ہے۔ قرآن میں بیان ہوا ہے کہ ان کے دو بیٹوں ہابیل

۲۔ الصافات ۳۷:۱۰۷۔

۳۔ بخاری، رقم ۵۲۴۵۔ مسلم، رقم ۱۹۶۶۔

۴۔ یعنی نحر کے لیے جانور کو کھڑا کر کے اور ذبح کی صورت میں قبلہ رو لٹا کر۔

اور قابیل نے اپنی اپنی نذر اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش کی تو ایک کی نذر قبول کر لی گئی اور دوسرے کی قبول نہیں ہوئی: 'إِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ أَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْآخَرِ'[6]۔ بائیبل میں صراحت ہے کہ ہابیل نے اس موقع پر اپنی بھیڑ بکریوں کے کچھ پہلوٹے بچوں کی قربانی پیش کی تھی۔ پیدایش میں ہے:

''اور آدم اپنی بیوی حوا کے پاس گیا اور وہ حاملہ ہوئی اور اس کے قائین پیدا ہوا۔ تب اُس نے کہا: مجھے خداوند سے ایک مرد ملا۔ پھر قائین کا بھائی ہابل پیدا ہوا۔ اور ہابل بھیڑ بکریوں کا چرواہا اور قائین کسان تھا۔ چند روز کے بعد یوں ہوا کہ قائین اپنے کھیت کے پھل کا ہدیہ خداوند کے واسطے لایا اور ہابل بھی اپنی بھیڑ بکریوں کے کچھ پہلوٹھے بچوں کا اور کچھ ان کی چربی کا ہدیہ لایا اور خداوند نے ہابل اور اس کے ہدیے کو منظور کر لیا۔ پر قائین کو اور اُس کے ہدیے کو منظور نہ کیا۔'' (۴: ۱۔۵)

یہ طریقہ بعد میں بھی، ظاہر ہے کہ قائم رہا ہوگا۔ چنانچہ اس کے آثار ہم کو تمام قدیم مذاہب میں ملتے ہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کے بعد، البتہ جو اہمیت و عظمت اور وسعت و ہمہ گیری اس عبادت کو حاصل ہوئی ہے، وہ اس سے پہلے، یقیناً حاصل نہیں تھی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنی قوم کے ایمان سے مایوس ہو کر ہجرت کی تو اس کے ساتھ ہی دعا فرمائی کہ پروردگار، تو مجھے صالح اولاد عطا فرما۔ یہ دعا قبول ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے انھیں ایک فرزند کی ولادت کی خوش خبری دی۔ یہ فرزند اسمٰعیل تھے۔ قرآن کا بیان ہے کہ یہ جب باپ کے ساتھ دوڑنے پھرنے کی عمر کو پہنچے تو ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ انھیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت ہو رہی ہے کہ اس بیٹے کو اپنے پروردگار کی خاطر قربان کر دیں۔ یہ ہدایت اگرچہ خواب میں ہوئی تھی اور خواب کی باتیں تاویل و تعبیر کی محتاج ہوتی ہیں، چنانچہ اس خواب کی تعبیر بھی یہی تھی کہ وہ بیٹے کو معبد کی خدمت کے لیے اللہ تعالیٰ کی نذر کر دیں، اس سے ہرگز یہ مقصود نہ تھا کہ وہ فی الواقع اسے ذبح کر دیں، لیکن خدا کے اس صداقت شعار بندے نے کوئی تعبیر نکالنے کے بجائے من و عن اس کی تعمیل کا فیصلہ کر لیا اور اس راہ میں پہلا قدم یہ اٹھایا کہ فرزند کے حوصلے کا اندازہ کرنے کے لیے اپنا خواب اسے بتایا۔ سیدنا اسمٰعیل نے اس خواب کو خدا کا حکم سمجھا اور فوراً جواب دیا کہ ابا جان، آپ بے دریغ اس کی تعمیل کریں۔ ان شاء اللہ، آپ مجھے پوری طرح ثابت قدم پائیں گے۔ بچے کے جواب سے مطمئن ہو کر ابراہیم اس کو مروہ کی پہاڑی کے پاس لے گئے اور قربانی کے لیے پیشانی کے بل لٹا دیا۔ قریب تھا کہ چھری چل جاتی، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ندا آئی: ابراہیم تم نے خواب کو سچ کر دکھایا۔ یہ ایک بڑی آزمایش تھی، تم اس میں

۵؎ الصافات ۳۷: ۱۰۳۔

۶؎ المائدہ ۵: ۲۷۔

کامیاب ہوئے، لہٰذا اب مزید کسی اقدام کی ضرورت نہیں رہی۔ چنانچہ ابراہیم کے اس فرزند جلیل کو اللہ تعالیٰ نے ایک مینڈھے کی قربانی کے عوض چھڑا لیا اور اس واقعے کی یادگار کے طور پر ہر سال اسی تاریخ کو قربانی کی ایک عظیم روایت ہمیشہ کے لیے قائم کر دی گئی۔ یہی قربانی ہے جو حج وعمرہ کے موقع پر اور عیدالاضحیٰ کے دن ہم ایک نفل عبادت کے طور پر پورے اہتمام کے ساتھ کرتے ہیں۔ ارشاد فرمایا ہے:

قَالُوا: ابْنُوا لَهٗ بُنْيَانًا، فَاَلْقُوْهُ فِی الْجَحِيْمِ، فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ . وَقَالَ: اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَيَهْدِيْنِ. رَبِّ هَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ، فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ . فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْیَ، قَالَ: يٰبُنَیَّ اِنِّیْٓ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْٓ اَذْبَحُكَ، فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی؟ قَالَ: يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْٓ، اِنْ شَآءَ اللّٰهُ، مِنَ الصّٰبِرِيْنَ. فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ، وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ، قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا، اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِيْنَ، اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ، وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ.

(الصافات ۳۷: ۹۷۔۱۰۷)

”انھوں نے کہا: اس کے لیے ایک چنائی چنو اور اسے آگ میں جھونک دو۔ اس طرح انھوں نے اس کے خلاف ایک چال کرنی چاہی تو ہم نے انھی کو نیچا دکھا دیا۔ اور (ابراہیم نے یہ دیکھا تو) کہا: میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں، وہ میری رہنمائی فرمائے گا۔ پروردگار، مجھے صالح اولاد عطا فرما۔ (اُس نے یہ دعا کی) تو ہم نے اسے ایک بردبار فرزند کی بشارت دی۔ پھر جب وہ اس کے ساتھ چلنے پھرنے کی عمر کو پہنچ گیا تو (ایک دن) اُس نے کہا: بیٹا، میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں۔ اب بتاؤ، تمھاری کیا رائے ہے؟ اُس نے جواب دیا: ابا جان، آپ کو جو حکم دیا جا رہا ہے، اس کی تعمیل کیجیے۔ آپ ان شاء اللہ مجھے ثابت قدم پائیں گے۔ آخر کو جب دونوں نے اپنے آپ کو حوالے کر دیا اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا اور ہم نے ندا دی کہ اے ابراہیم، تو نے خواب کو سچ کر دکھایا۔ بے شک ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک کھلی آزمایش تھی۔ (ابراہیم اس میں کامیاب ہوا) اور (اِس کے نتیجے میں) اسمٰعیل کو ہم نے ایک بڑی قربانی کے عوض چھڑا لیا۔“

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

قربانی کا مقصد

قربانی کا مقصد اللہ تعالیٰ کی شکرگزاری ہے۔ ہم اپنی جان کا نذرانہ قربانی کے جانوروں کو اس کی علامت بنا کر بارگاہ خداوندی میں پیش کرتے ہیں تو گویا اسلام واخبات کی اس ہدایت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں جس کا اظہار سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اکلوتے فرزند کی قربانی سے کیا تھا۔ اس موقع پر تکبیر وتہلیل کے الفاظ اسی مقصد سے ادا کیے جاتے ہیں۔ قرآن نے یہ مقصد اس طرح واضح فرمایا ہے:

لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَا دِمَاؤُھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ، کَذٰلِکَ سَخَّرَھَا لَکُمْ لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰکُمْ، وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِیْنَ. (الحج ۲۲: ۳۷)

”اللہ کو نہ (تمھاری) اِن (قربانیوں) کا گوشت پہنچتا ہے، نہ خون، بلکہ صرف تمھارا تقویٰ پہنچتا ہے۔ اُس نے اِسی طرح اِن کو تمھاری خدمت میں لگا دیا ہے تاکہ اللہ نے جو ہدایت تمھیں بخشی ہے، اُس پر تم اُس کی تکبیر کرو۔ (یہی طریقہ ہے اُن کا جو خوبی کا رویہ اختیار کریں) اور (اے پیغمبر) اِن خوب کاروں کو بشارت دو۔“

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

قربانی کا قانون

قربانی کا جو قانون مسلمانوں کے اجماع اور تواتر عملی سے ہم تک پہنچا ہے، وہ یہ ہے:

قربانی انعام کی قسم کے تمام چوپایوں کی ہو سکتی ہے،

اس کا جانور بے عیب اور اچھی عمر کا ہونا چاہیے،

قربانی کا وقت یوم النحر ۱۰/ ذوالحجہ کو عید الاضحیٰ کی نماز سے فراغت کے بعد شروع ہوتا ہے،

اس کے ایام وہی ہیں جو مزدلفہ سے واپسی کے بعد منیٰ میں قیام کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ سورۂ حج کی آیات میں 'اَیَّامٍ مَّعْلُوْمَاتٍ' سے یہی مراد ہیں[۷]۔ اصطلاح میں انھیں ایام تشریق کہا جاتا ہے۔ قربانی کے علاوہ ان ایام میں یہ بھی مشروع ہے کہ ہر نماز کی جماعت کے بعد تکبیریں کہی جائیں۔ نمازوں کے بعد تکبیر کا یہ حکم مطلق ہے، اس کے کوئی خاص الفاظ شریعت میں مقرر نہیں کیے گئے۔

۷۔ ۲۲: ۲۸۔ ”اور چند متعین دنوں میں اُن چوپایوں پر اللہ کا نام لیں جو اُس نے اُن کو بخشے ہیں۔“

قربانی کا گوشت لوگ خود بھی بغیر کسی تردد کے کھا سکتے اور دوسروں کو بھی کھلا سکتے ہیں۔ 'فَکُلُوْا مِنْھَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ'[8] کے الفاظ میں قرآن نے اس کی صراحت کر دی ہے۔

قربانی کا قانون یہی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے البتہ، اس کے بارے میں چند باتوں کی وضاحت فرمائی ہے:

اول یہ کہ قربانی ہر حال میں عید کی نماز کے بعد کی جائے گی۔ یہ اگر پہلے کر لی گئی ہے تو محض ذبیحہ ہے، اسے عیدالاضحیٰ کی قربانی قرار نہیں دیا جا سکتا۔[9]

دوم یہ کہ قربانی کے لیے اچھی عمر یہ ہے کہ بکری کا بچہ کم سے کم ایک سال، گائے بیل دو سال اور اونٹ یا اونٹنی کم سے کم پانچ سال کی ہونی چاہیے۔ یہ میسر نہ ہوں تو مینڈھا ذبح کر لیا جائے۔ یہ اگر چھ ماہ کا بھی ہو تو کفایت کرے گا۔[10]

سوم یہ کہ گائے بیل اور اونٹ یا اونٹنی کی قربانی میں ایک سے زیادہ لوگ شریک ہو سکتے ہیں۔ یہ شرکا اگر سات بھی ہوں تو مضایقہ نہیں ہے،[11] بلکہ روایتوں میں آیا ہے کہ اونٹ کی قربانی میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ایک موقع پر دس افراد شریک ہوئے تو آپ نے منع نہیں فرمایا۔[12]

چہارم یہ کہ قربانی ایک نفل عبادت کے طور پر عیدالاضحیٰ کے علاوہ بھی کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ لوگوں نے جب عقیقے کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا: تم میں سے جو بچے کی پیدایش پر قربانی کرنا چاہے، کر لے۔[13]

---

۸ الحج ۲۲: ۳۶۔ ''سو اِس میں سے خود بھی کھاؤ اور اُن کو بھی کھلاؤ جو قناعت کیے بیٹھے ہیں اور اُن کو بھی جو مانگنے کے لیے آ جائیں۔''

۹ بخاری، رقم ۵۲۳۶، ۵۲۴۴، ۵۴۴۳۔ مسلم، رقم ۹۶۰، ۱۹۶۱، ۱۹۶۲۔

۱۰ مسلم، رقم ۱۹۶۳۔ ابوداؤد، رقم ۲۷۹۹۔

۱۱ مسلم، رقم ۱۳۱۸۔

۱۲ ابن ماجہ، رقم ۳۱۳۱۔ ترمذی، رقم ۱۵۰۱۔

۱۳ الموطا، رقم ۱۰۶۶۔ ابوداؤد، رقم ۲۸۴۲۔

افادات غامدی

مرتب: منظور الحسن

اسلامی نظریاتی کونسل کا کردار

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

گزشتہ دنوں روزنامہ ''جنگ'' کے نمائندے نے جناب جاوید احمد صاحب غامدی سے یہ سوال کیا کہ پاکستان جیسی مسلم ریاست میں ''اسلامی نظریاتی کونسل'' کا کردار کیا ہونا چاہیے، کیا یہ کردار اس نے ادا کیا ہے اور اس بنا پر اس کی کارکردگی کیسی رہی ہے، مزید براں اسے ایک موثر ادارہ کیسے بنایا جا سکتا ہے؟ اس سوال کے جواب میں غامدی صاحب نے جو گفتگو کی، اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

''اسلامی نظریاتی کونسل'' ریاست پاکستان کا ایک آئینی ادارہ ہے۔ اس کا بنیادی فریضہ پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کو اسلامی قانون کی تدوین کے لیے سفارشات پیش کرنا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ کام ملک وملت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے بارے میں جو شکوک وشبہات یا سوالات اس وقت دنیا میں پیدا ہو رہے ہیں، ان میں سے بیش تر کا تعلق فقہ وشریعت ہی سے ہے۔ جہاد وقتال کے حدود وشرائط، نظم سیاست اور اس میں شوریٰ کی نوعیت، نظم معیشت اور سودی نظام کے مسائل، خواتین کے حوالے سے پردہ، تعدد ازواج اور طلاق وغیرہ کے احکام، شہادت اور دیت کے بارے میں قوانین، قتل، زنا، چوری اور ارتداد جیسے جرائم کی سزائیں، موسیقی، مصوری اور دیگر فنون لطیفہ کی شرعی حیثیت اور اس نوعیت کے متعدد موضوعات ہیں جن کے بارے میں سوالات زبان زد عام ہیں۔ ہمارے علما کے پاس چونکہ ان سوالوں کے تسلی بخش جواب نہیں ہیں، اس لیے یہ تصور قائم کیا جا رہا ہے کہ اسلامی شریعت عہد رفتہ کی یادگار ہے۔ تمدن کے ارتقا کے نتیجے میں انسانوں کے انفرادی اور اجتماعی معاملات

میں جو تغیرات ہوئے ہیں، یہ ان سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت سے محروم ہے۔ چنانچہ دور جدید میں اسے ریاستی سطح پر نافذ کرنا ممکن نہیں ہے۔

اس تناظر میں ''اسلامی نظریاتی کونسل'' سے مقصود اصل میں یہی ہے کہ وہ:

اولاً، اسلامی شریعت کے بارے میں پائے جانے والے شکوک وشبہات کو رفع کرے۔

ثانیاً محل اجتہاد معاملات کو متعین کرے اور ان میں اپنی اجتہادی آرا سے قوم وملت کو آگاہ کرے۔

ثالثاً، پارلیمنٹ کی رہنمائی کے لیے انفرادی اور اجتماعی معاملات کے بارے میں قوانین مرتب کرے۔

یہی وہ تقاضے ہیں جنھیں مصور پاکستان علامہ اقبال نے قیام پاکستان سے پہلے ہی محسوس کر لیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی کتاب 'Reconstruction of religious thought in Islam' میں اسے موضوع بنایا اور اس امر کا اظہار کیا کہ شریعت کا جوڑھانچا اس وقت موجود ہے، وہ نہ اسلام کی دعوت کے لیے موزوں ہے اور نہ اس کے نفاذ کے لیے۔ انھوں نے ان اہم عملی مسائل کی فہرست بندی بھی کی جن کا شریعت کے اس پیش کردہ ڈھانچے میں کوئی حل بیان نہیں ہوا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ''اسلامی نظریاتی کونسل'' ان ضرورتوں کو پورا کرنے کی اہلیت رکھتی ہے تو میرے نزدیک اس کا جواب نفی میں ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا نظام تعلیم ایسے جید علما تیار کرنے سے قاصر ہے جو دور جدید کی اس ضرورت کو پورا کرنے کے اہل ہوں۔ یہ نظام تعلیم تقلید جامد کے اصول پر قائم ہے۔ اس کا اصرار ہے کہ دین کی تعبیر و تشریح کے حوالے سے قدیم علما کا کام ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ ان کے کام کی تفہیم اور شرح و وضاحت تو ہو سکتی ہے، مگر اس پر نظر ثانی کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ دور اول کے فقہا نے جو اصول وقوانین مرتب کیے ہیں، وہ تغیرات زمانہ کے باوجود قابل عمل ہیں۔ اس ضمن میں تحقیق و اجتہاد کی نہ ضرورت ہے اور نہ اس بات کا اب کوئی امکان کہ کوئی شخص مجتہد کے منصب پر فائز ہو سکے۔ ہمارے علما اسی نظام تعلیم کی پیداوار ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی انفرادی حیثیت میں ہوں یا کسی ادارے کی صورت میں مجتمع ہو کر اپنے فرائض انجام دے رہے ہوں، وہ اس کی اہلیت ہی سے محروم ہیں کہ اسلامی شریعت کی شرح و وضاحت کر سکیں یا جن معاملات میں شریعت خاموش ہے، ان کے بارے میں اپنی آرا پیش کر سکیں۔ یہی علما ''اسلامی نظریاتی کونسل'' کا حصہ ہیں، لہٰذا اس ادارے یا ایسے کسی دوسرے ادارے سے اس طرح کی توقع رکھنا عبث ہے کہ وہ اسلامی شریعت کے بارے میں ان سوالات کا جواب دے سکے جو مسلمانوں کے ذہین عناصر کی جانب سے اٹھائے جا رہے ہیں اور ان شکوک وشبہات کو رفع کر سکے جن کا اسلام کو عالمی سطح پر سامنا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

چنانچہ ''اسلامی نظریاتی کونسل'' کی کارکردگی کا جائزہ اگر اس پہلو سے پیش نظر ہے کہ آیا اس نے ایسے قوانین مرتب کیے ہیں جو اسلامی شریعت کے عین مطابق ہیں اور دور حاضر کی ضرورتوں کو ہر لحاظ سے پورا کرتے ہیں تو اس کی کارکردگی صفر ہے، لیکن اگر اس زاویے سے دیکھا جائے کہ اس نے موجودہ زمانے کے مسائل سے قطع نظر روایتی مذہبی افکار کی روشنی میں قوانین کی تدوین کے لیے اپنی سفارشات پیش کی ہیں تو اس کی کارکردگی سو فی صد ہے۔

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ اسے ایک موثر ادارہ کیسے بنایا جائے تو میرے نزدیک اس کے لیے یہ تین اقدامات ناگزیر ہیں:

۱۔ مذہبی نظام تعلیم کی اصلاح کی جائے تاکہ وہ ایسے علما پیدا کر سکے جو حقیقی معنوں میں اسلامی قانون کی تدوین کا فریضہ انجام دے سکیں۔

۲۔ کونسل کی رکنیت کے لیے میرٹ کو بنیاد بنایا جائے۔

۳۔ پارلیمنٹ کو اس بات کا پابند کیا جائے کہ وہ اس کی سفارشات پر بحث کر کے ان کے ردو قبول کا فیصلہ کرے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آل عمران

(۲۴)

(گزشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ، قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ، اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ، وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا، وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾

محمد ایک رسول ہی ہیں۔ (اُن کے شہید ہو جانے کی خبر نے تمھارے قدم ڈگمگا دیے)۔ اُن سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں، (اور موت وحیات کے یہ مراحل اُن پر بھی آئے)[۲۱۷]۔ پھر کیا وہ وفات پا جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے[۲۱۸]؟ (یاد رکھو)، جو الٹا پھرے گا، وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا اور اللہ عنقریب اُن کو صلہ دے گا جو ہر حال میں اُس کے شکر گزار رہے ہیں[۲۱۹]۔ ۱۴۴

---

[۲۱۷] مطلب یہ ہے کہ دوسرے رسولوں کو جو آزمایشیں پیش آئی ہیں، وہ سب انھیں بھی پیش آسکتی ہیں اور جس طرح انھیں موت کے مرحلے سے گزرنا پڑا، اسی طرح انھیں بھی ایک دن اس مرحلے سے گزرنا ہے۔ ان کے رسول ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انھیں موت نہیں آئے گی یا یہ کسی آزمایش سے دوچار نہیں ہوں گے۔

[۲۱۸] یعنی اسلام کو چھوڑ کر ایک بار پھر جاہلیت کی طرف لوٹ جاؤ گے۔

[۲۱۹] یعنی جاہلیت کی طرف لوٹنے کا خیال بھی ان کے ذہن میں نہیں گزرا اور وہ اس بات پر ہمیشہ اپنے

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ، كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا، وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا، نُؤْتِهٖ مِنْهَا، وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ، نُؤْتِهٖ مِنْهَا، وَسَنَجْزِی الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ، فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا، وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ

(تم نے حوصلہ چھوڑ دیا) اور (اِس حقیقت کو فراموش کر بیٹھے کہ) ہر شخص اللہ کے اذن سے ایک مقررہ نوشتہ کے مطابق ہی دنیا سے رخصت ہوتا ہے اور (اِس کو بھی کہ) جو دنیا کا صلہ چاہے گا، اُس کو ہم اُسی میں سے دیں گے اور جو آخرت کا صلہ چاہے گا، اُس کو وہاں سے دیں گے اور اپنے شکر گزاروں کو ہم اُن کی جزا لازماً عطا فرمائیں گے۔[220] ۱۴۵

(اِن حقائق کو سمجھنے کی کوشش کرو) اور (یاد رکھو کہ) کتنے ہی نبی گزرے ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والوں نے جنگ کی ہے تو اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں انھیں پیش آئیں، اُن سے نہ تو وہ پست ہمت ہوئے، نہ انھوں نے کمزوری دکھائی اور نہ دشمنوں کے آگے سپر ڈالی ہے،[221] (بلکہ ہر حال میں

پروردگار کے شکر گزار رہے کہ اس نے انھیں اسلام کی نعمت سے بہرہ یاب کیا ہے۔

[۲۲۰] یہ مخاطبین کو ان کمزوریوں کی طرف توجہ دلائی ہے جن کی وجہ سے وہ اللہ و رسول کے بارے میں ایسے گمانوں میں مبتلا ہوئے جن کا ذکر یہاں ہو رہا ہے۔ ان میں سے خاص طور پر دو چیزوں کو نمایاں کیا ہے: ایک یہ کہ وہ اس بات پر عقیدہ نہیں رکھتے کہ ہر شخص کی موت کا ایک دن مقرر ہے، اس کو نہ کوئی شخص پہلے لا سکتا ہے اور نہ آجانے کے بعد ایک لمحے کے لیے ٹال سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کی سعی و جہد کا مقصود یہی دنیا ہے۔ اپنے دنیوی مفادات سے آگے وہ کسی چیز کو بھی دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، لہٰذا انھیں باور نہیں آتا کہ دنیا کی محرومیوں کا ازالہ آخرت میں ہو جائے گا اور جو لوگ یہاں کھو رہے ہیں، وہ فی الواقع اپنے ایثار کا بھرپور صلہ وہاں پا لیں گے۔

[۲۲۱] اس مفہوم کے لیے اصل میں 'وھن'، 'ضعف' اور 'استکانة' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ اگرچہ کمزوری کے معنی میں کچھ مشترک سے ہیں، لیکن ان میں باریک سا فرق بھی ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اس فرق

اِلَّآ اَنْ قَالُوْا: رَبَّنَا، اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا، وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا، وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا، وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ فَاٰتٰهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا، وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ، وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴۸﴾

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا، اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ،

ثابت قدم رہے) اور اللہ ایسے ہی ثابت قدم رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اُن کی دعا بس یہ رہی کہ پروردگار، ہمارے گناہوں سے درگزر فرما؛ اپنے معاملات میں جو کچھ زیادتی ہم سے ہوئی ہے، اُسے معاف کر دے؛ ہمارے قدم جما دے اور منکروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔ پھر اللہ نے اُن کو دنیا کا صلہ بھی دیا اور آخرت کا اچھا اجر بھی عطا فرمایا۔ (یہی ہیں جو خوبی سے عمل کرنے والے ہیں) اور اللہ ایسے ہی خوب کاروں کو پسند کرتا ہے۔ ۱۴۶-۱۴۸

ایمان والو، اگر اِن منکروں کی بات مانو گے تو یہ تمھیں الٹا پھیر کر رہیں گے اور تم نامراد ہو جاؤ گے۔[۲۲۲] (یہ لوگ نہیں)، بلکہ اللہ ہی تمھارا مددگار ہے اور اُسی کی مدد سب سے بہتر ہے۔ (تم دیکھو گے

کی وضاحت اس طرح فرمائی ہے:

''... موت سے خوف اور زندگی کی محبت سے دل میں جو بزدلی پیدا ہوتی ہے، یہ وہن ہے۔ اس وہن سے ارادے اور عمل میں جو تعطل پیدا ہوتا ہے، وہ ضعف ہے۔ اس ضعف سے حریف کے آگے گھٹنے ٹیک دینے کا جو نتیجہ ظہور میں آتا ہے، وہ استکانت ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۱۸۷)

آیت کا مدعا یہ ہے کہ جنگ و جدال کا پیش آنا اور اس کے نتیجے میں مصائب و شدائد سے گزرنا انبیا علیہم السلام کے لیے کوئی انوکھا معاملہ نہیں ہے کہ اسے دیکھ کر یہ لوگ بددل ہو رہے ہیں۔ اس طرح کے معاملات اس سے پہلے بھی بہت سے پیغمبروں کو پیش آ چکے ہیں۔ داؤد و سلیمان اور موسیٰ علیہم السلام کی جنگوں کا ذکر بائیبل میں جگہ جگہ ہوا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے قانون ابتلا کا لازمی تقاضا ہے۔ اس سے کسی صاحب ایمان کو کوئی پریشانی نہیں ہونی چاہیے۔

[۲۲۲] یہ اس پروپیگنڈے کی طرف اشارہ ہے جو احد کی شکست کے بعد کیا گیا اور جس سے مکہ کے ائمۂ کفر نے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ محمد اگر خدا کے فرستادہ ہوتے تو انھیں شکست نہ ہوتی۔ اس لیے یقین رکھو کہ یہ محض تدبیر

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

فَتَنۡقَلِبُوۡا خٰسِرِيۡنَ ﴿۱۴۹﴾ بَلِ اللّٰهُ مَوۡلٰكُمۡ، وَهُوَ خَيۡرُ النّٰصِرِيۡنَ ﴿۱۵۰﴾ سَنُلۡقِيۡ فِيۡ
قُلُوۡبِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوا الرُّعۡبَ بِمَاۤ اَشۡرَكُوۡا بِاللّٰهِ، مَا لَمۡ يُنَزِّلۡ بِهٖ سُلۡطٰنًا،
وَمَاۡوٰهُمُ النَّارُ، وَبِئۡسَ مَثۡوَى الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۱۵۱﴾

کہ)اِن منکروں کے دل میں ہم تمھارا رعب بٹھا دیں گے، اِس لیے کہ اِنھوں نے اللہ کے ساتھ اُن چیزوں کو شریک ٹھیرایا ہے جن کے حق میں اُس نے کوئی سند نہیں اتاری ہے۔ اِن کا ٹھکانا دوزخ ہے اور اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والوں کے لیے یہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے۔ ۱۴۹۔۱۵۱

اور وسائل کا کھیل ہے جس میں ایک مرتبہ انھیں فتح ہوئی اور اب ہم جیت گئے ہیں، اس کا خدا اور فرشتوں کی مدد سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

[باقی]

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

معز امجد

کسی آدمی پر کفر کا الزام لگانا

رُوی ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: اذا قال الرجل لصاحبہ[2]: "یا کافر" فانھا تجب علی احدھما . فان کان الذی قبل لہ کافر فھو کافر. والا رجع الیہ ما قال[3].

''روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب کوئی آدمی اپنے ساتھی سے کہے: ''اے کافر''، تو دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ یہ (کفر) چپک جائے گا۔ وہ آدمی جسے کافر کہا گیا، اگر واقعتہً کافر ہوا[1] پھر تو وہی کافر ہوگا وگرنہ کہنے والے نے جو کچھ کہا، وہ اسی کی طرف لوٹ آئے گا[2]۔''

ترجمے کے حواشی

۱۔ یعنی خدا کے نزدیک اگر وہ کافر ہے۔

۲۔ یعنی اگر کوئی آدمی کسی ایسے آدمی پر کفر کا الزام لگائے جو حقیقت میں کافر نہیں ہے تو الزام لگانے والے کو اس غلط الزام کا نتیجہ یہ بھگتنا ہوگا کہ اسے خدا کے ہاں کافر سمجھا جائے گا۔ تاریخ گواہ ہے کہ مختلف لوگوں اور گروہوں کے

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

خلاف کفر کے فتووں نے لوگوں میں نفرت اور فرقہ بندی ہی کے بیج بوئے ہیں۔ ہر مذہبی گروہ اپنے آپ کو حق کا معیار سمجھتا ہے اور کسی فروعی اور فقہی معاملے میں بھی اپنے سے اختلاف کرنے والوں کے خلاف کفر اور بے دینی کے فتوے جاری کر دیے جاتے ہیں۔ زیر بحث روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اسی غلط رویے کے نتائج سے خبردار کیا ہے کہ اگر انھوں نے اپنے بھائیوں کے خلاف کفر کے ایسے ہی غلط الزام لگائے تو خدا کی نظر میں الزام لگانے والے خود کافر قرار پا جائیں گے۔

متن کے حواشی

ا۔ یہ روایت احمد بن حنبل، رقم ۵۸۲۴ ہے۔ بعض اختلافات کے ساتھ یہ درج ذیل مقامات پر نقل ہوئی ہے:
بخاری، رقم ۵۷۵۲، ۵۷۵۳۔ مسلم، رقم ۶۰۔ موطا، رقم ۱۷۷۷۔ ترمذی، رقم ۲۶۳۷۔ احمد بن حنبل، رقم ۴۶۸۷، ۴۷۴۵، ۵۰۳۵، ۵۰۷۷، ۵۲۵۹، ۵۲۶۰، ۵۹۱۴، ۵۹۳۳، ۶۲۸۰۔ ابن حبان، رقم ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰۔ بیہقی، رقم ۲۰۶۹۱۔ ابوداؤد، رقم ۴۶۸۷۔ حمیدی، رقم ۶۹۸۔

۲۔ بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۵۰۳۵ میں 'لصاحبہ' (اپنے ساتھی سے) کے بجائے 'للرجل' (کسی آدمی سے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

۳۔ بعض روایات مثلاً ابوداؤد، رقم ۴۶۸۷ میں مذکورہ روایت اس طرح نقل ہوئی ہے: 'ایما رجل مسلم اکفر رجلا مسلما فان کان کافرا والا کان ھو الکافر' (جب ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو کافر قرار دیتا ہے تو اگر وہ واقعی کافر ہے تو ٹھیک ہے وگرنہ ایسا کہنے والا کافر قرار پائے گا)۔

مسلم، رقم ۶۰ کے مطابق یہ روایت یوں نقل ہوئی ہے: 'اذا کفر الرجل اخاہ فقد باء بھا احدھما' (جب کوئی آدمی اپنے بھائی کو کافر قرار دیتا ہے تو دونوں میں سے کوئی ایک لازماً کفر کے ساتھ پلٹتا ہے)۔

احمد بن حنبل، رقم ۶۲۸۰ کے مطابق یہ روایت اس طرح روایت ہوئی ہے: 'من کفر اخاہ فقد باء بھا احدھما' (جو کوئی اپنے بھائی کو کافر قرار دیتا ہے تو دونوں میں سے کوئی ایک لازماً کفر کے ساتھ لوٹے گا)۔

بخاری، رقم ۵۷۵۳ کے مطابق یہ روایت یوں ہے: 'ایما رجل قال لاخیہ یا کافر فقد باء بھا احدھما' (جب کوئی آدمی اپنے بھائی سے کہتا ہے "اے کافر" تو دونوں میں سے کوئی ایک لازماً کافر ہوگا)۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

احمد بن حنبل، رقم ۴۶۸۷ کے مطابق یہ روایت اس طرح نقل ہوئی ہے:'اذا احد کم قال لاخیه یا کافر فقد باء بها احدهما '(جب تم میں سے کوئی اپنے بھائی سے کہے''اے کافر''تو دونوں میں سے کوئی ایک لازماً کفر کے ساتھ واپس آئے گا)۔

احمد بن حنبل، رقم ۵۲۶۰ کے مطابق یہ روایت اس طرح سے ہے:'ایما رجل کفر رجلا فاحدهما کافر '(جب کوئی آدمی دوسرے کو کافر قرار دیتا ہے تو دونوں میں سے کوئی ایک لازماً کافر ہوگا)۔

بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۵۲۵۹ میں 'رجل '(آدمی) کے بجائے اس کا ہم معنی لفظ 'امری' روایت ہوا ہے۔

بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۵۰۳۵ کے مطابق مذکورہ روایت کا آخری حصہ یوں نقل ہوا ہے:'ان کان کما قال والا رجعت علی الآخر '(اگر وہ ایسا ہی ہے کہ جیسا اسے کہا گیا تو ٹھیک ہے وگرنہ الزام دوسرے آدمی کی طرف پلٹ جائے گا)۔

ابن حبان، رقم ۲۴۸ کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان اس طرح سے ہے:

ما اکفر رجل رجلا قط الا باء احدهما بها ان کان کافرا والا کفر بتکفیره.	''کبھی کوئی آدمی دوسرے کو کافر قرار نہیں دیتا، مگر یہ کہ دونوں میں سے کوئی ایک ضرور کافر ہوگا۔ جسے کافر کہا گیا، اگر وہ کافر ہے، (تو ایسا ہی ہوگا) لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو کافر کہنے والا اپنے کفر کے الزام کی وجہ سے کافر قرار پائے گا۔''

تخریج: محمد اسلم نجمی

کوکب شہزاد

ترجمہ وترتیب: اظہار احمد

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

طالب محسن

توحید اور نجات

(مسلم، رقم ۳۰)

عن معاذ بن جبل قال: کنت ردف النبی صلی اللّٰہ علیه و سلم. لیس بینی و بینه إلا مؤخرة الرحل. فقال: یا معاذ بن جبل. قلت: لبیك رسول اللّٰہ و سعدیك. ثـم سار ساعة. ثم قـال: یـا معاذ بن جبل. قلت: لبیك رسول اللّٰہ و سعدیك. ثـم سار ساعة. ثـم قال: یا معاذ بن جبل. قلت: لبیك رسـول اللّٰہ و سعدیك. قـال: هـل تـدری مـا حق اللّٰہ علی العباد؟ قـال: قلت: اللّٰہ و رسوله اعلم. قـال: فإن حق اللّٰہ علی العباد أن یعبدوه ولا یشرکوا به شیئا. ثم سار ساعة. ثم قال: یا معاذ بن جبل قلت: لبیك رسول اللّٰہ و سعدیك. قـال: هـل تدری ما حق العباد علی اللّٰہ إذا فعلوا ذلك؟ قال: قلت: اللّٰہ و رسوله أعلم. قال: أن لا یعذبهم.

''حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں (سواری پر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا اور میرے اور آپ کے بیچ میں صرف کجاوے کی انی تھی۔ آپ نے فرمایا: معاذ بن جبل۔ میں نے کہا: حاضر، حاضر، رسول اللہ، میری خوش نصیبی۔ پھر آپ کچھ دیر چلتے رہے۔ پھر فرمایا: معاذ بن جبل۔ میں نے کہا: حاضر، حاضر، رسول اللہ، میری خوش نصیبی۔ آپ نے پوچھا: تم جانتے ہو کہ اللہ کا بندوں پر کیا حق ہے؟ میں نے کہا: اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے بتایا: اللہ کا بندوں پر حق یہ ہے کہ وہ اس کی بندگی کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ پھر آپ کچھ دیر چلے۔ پھر کہا: معاذ بن جبل۔ میں نے کہا: حاضر، حاضر، رسول اللہ، میری خوش نصیبی۔ آپ نے فرمایا: جانتے ہو، جب اس کے بندے یہ کرلیں تو بندوں کا اللہ پر کیا حق ہے؟ میں نے کہا: اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: یہ کہ وہ انھیں عذاب نہ دے۔‘‘

عن معاذ بن جبل قال كنت ردف رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم على حمار، يقال له عُفَير. قال: فقال: يا معاذ، تدرى ما حق اللّٰه على العباد وما حق العباد على اللّٰه؟ قال: اللّٰه ورسوله أعلم . قال: فإن حق اللّٰه على العباد أن يعبدوا اللّٰه ولا يشركوا به شيئا . وحق العباد على اللّٰه عز وجل أن لا يعذب من لا يشرك به شيئا . قال: قلت: يا رسول اللّٰه، أفلا أبشر الناس. قال: لا تبشرهم فيتكلوا.

’’معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک گدھے پر جسے عُفَیر کہتے ہیں، بیٹھا ہوا تھا کہ آپ نے مجھ سے پوچھا: معاذ، جانتے ہو اللہ کا بندوں پر اور بندوں کا اللہ پر کیا حق بنتا ہے۔ کہتے ہیں: میں نے کہا: اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: اللہ کا بندوں پر حق یہ ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور بندوں کا اللہ پر حق یہ ہے کہ وہ ان کو عذاب نہ دے جو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ٹھہرائیں۔ کہتے ہیں: میں نے حضور سے پوچھا: کیا میں لوگوں کو خوش خبری نہ دوں۔ آپ نے فرمایا: انھیں یہ خبر نہ سناؤ، وہ اسی پر بھروسا کرنے لگیں گے۔''

عن معاذ بن جبل رضی اللّٰہ عنه قال : قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: یا معاذ، أتدری ما حق اللّٰہ علی العباد؟ قال: اللّٰہ ورسوله أعلم. قال: أن یعبد اللّٰہ ولا یشرك به شئ. قال: أتدری ماحقهم علیه اذا فعلوا ذلك؟ فقال: اللّٰہ ورسوله أعلم. قال: أن لا یعذبهم.

''حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: معاذ، جانتے ہو بندوں پر اللہ کا حق کیا ہے؟ کہا: اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: یہ کہ اس کی عبادت کی جائے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ آپ نے پوچھا: جانتے ہو، اس پر ان کا حق کیا ہے جب وہ یہ کرلیں۔ کہا: اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: یہ کہ وہ انھیں عذاب نہ دے۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

عن الأسود بن هلال قال: سمعت معاذا یقول: دعانی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم فأجبته. فقال: هل تدری ما حق اللّٰہ علی الناس نحو حدیثهم.

''اسود بن ہلال (مرحوم) بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو بیان کرتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے آواز دی۔ میں نے جواب دیا تو آپ نے پوچھا: جانتے ہو اللہ کا لوگوں پر کیا حق ہے؟ سابقہ روایت کی طرح۔''

لغوی مباحث

ردف: سوار کے پیچھے بیٹھنے والا۔ اسی معنی میں 'ردیف' کا لفظ بھی آتا ہے۔

مؤخرۃ: کجاوے کا ابھرا ہوا پچھلا حصہ۔

تدری : 'دری' اہل لغت اس کے معنی: 'کوشش اور سعی سے جاننا' بیان کرتے ہیں۔ زمخشری کی رائے میں 'درایۃ' وہ معرفت ہے جو چالاکی یا فریب سے حاصل کی جائے۔ اردو میں جاننے کے مترادف کسی لفظ میں سعی اور کوشش کا پہلو شامل نہیں ہے۔

حق: حق کا لفظ اپنے اندر کئی پہلو رکھتا ہے۔ یہاں اردو کے لفظ حقوق کے مفہوم میں آیا ہے۔ یعنی وہ چیز جو کسی دوسرے کے پہلو سے ایک انسان پر واجب اور لازم آتی ہے۔

فیتکلوا: 'اتکال' تکیہ کرنا۔ یہاں اس سے وہ بھروسا مراد ہے جس کے ساتھ سعی و جہد موجود نہ ہو۔

معنی

اس روایت کا بنیادی مضمون شرک کی شناعت اور اخروی نجات کے لیے اس سے اجتناب کی اہمیت کو واضح کرنا ہے۔ دین کی تعلیمات سے آگاہ ہر شخص جانتا ہے کہ توحید کو اس میں اساس کی حیثیت حاصل ہے۔ مذہبی افکار میں انسان کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ وہ کائنات کے خالق و مالک کے ساتھ کسی دوسری ہستی کو کسی بھی پہلو سے شریک مانے۔ چنانچہ تمام انبیا نوع انسانی کو اس غلطی اور اس کے خوف ناک انجام سے باخبر کرتے رہے ہیں۔ قرآن مجید کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شرک ایک ایسا جرم ہے جس کے مرتکب کی جہنم سے چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

اس روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اللہ ہی کی عبادت کرنے اور شرک سے اجتناب کو اللہ کا حق قرار دیا ہے۔ اس سے آپ کے پیش نظر یہ حقیقت واضح کرنا ہے کہ توحید کی حیثیت ایک علمی مسئلے کی نہیں ہے۔ شرک سے اجتناب اور صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا تمھارے اخلاقی وجود کا تقاضا ہے۔ انسان جب اپنی اور دوسری مخلوقات کی حقیقت سے آشنا ہوتا، اپنی بندگی کا شعور حاصل کرتا اور اللہ تعالیٰ کی عظمت، قدرت اور یکتائی کا ادراک کر لیتا ہے تو اس کا اخلاقی وجود شرک کی غلاظت کو جاننے میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتا۔

اس روایت میں دوسرا سوال اور اس کا جواب دراصل ایک بشارت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص شرک کے گناہ سے بچا رہے گا، اس کا اللہ تعالیٰ پر یہ حق قائم ہو جاتا ہے کہ وہ اسے بخش دے۔ لیکن یہاں یہ بات واضح رہے کہ یہ بشارت صرف ان کے لیے ہے جو اصلاً ایمان اور عمل صالح کے حامل ہوں۔ ان سے وہ جرائم نہ ہوئے ہوں جو

ایمان جیسی عظیم حقیقت کو بھی بے معنی کر کے رکھ دیں۔قتل، دوسرے کا حق کھا جانا اور زندگی بھر برائیوں کو اوڑھنا بچھونا بنائے رکھنا جیسے جرائم ایمان کی نعمت کے باوجود آدمی کو جہنم کا حق دار بنا دیتے ہیں۔معلوم ہوتا کہ توحید اپنی اصل حیثیت میں بخشش کی ضامن ہے۔لیکن اگر اس کے ساتھ ایسے جرائم جمع ہو گئے تو یہ اپنا یہ کردار ادا نہیں کر سکے گی۔

اس روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کی ایک جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقۂ تعلیم کیا تھا۔آپ کا طرز تخاطب کس قدر دل پزیر تھا۔آپ کے ساتھی آپ کے ساتھ کس قدر والہانہ لگاؤ رکھتے تھے۔ان کے اندر آپ کی عظمت کا احساس کس قدر شدت کے ساتھ موجود تھا۔اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ توحید کو لوگوں کے دلوں میں اتارنے کے لیے آپ نے کیا کیا اسالیب اختیار کیے تھے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات دوسروں کو بتانے سے منع کر دیا تھا۔اس سے آپ نے یہ واضح کر دیا کہ یہ نکتہ صرف ان لوگوں کے لیے ہے جن کی سیرت دین کے سانچے میں ڈھل چکی ہے۔

اس روایت سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ حضرت معاذ بن جبل کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں کیا حیثیت تھی۔آپ کے دینی شعور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اعتماد آپ کے دین کے علم وعمل میں مقام کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

متون

اس روایت کے کچھ متون امام مسلم نے نقل کیے ہیں۔ان متون سے واضح ہے کہ کچھ راویوں نے اختصار کا طریقہ اختیار کیا ہے اور کچھ نے تفصیل سے جزئیات بیان کی ہیں۔اس کے متون کے مطالعے سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ واقعہ کس سفر میں پیش آیا تھا۔البتہ ایک متن میں یہ تصریح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس سفر میں باری باری کسی نہ کسی کو اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے سفر کر رہے تھے۔ایک روایت میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ حضور کا ہر سفر میں معمول یہی تھا۔نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے بیٹھنے کو مختلف الفاظ سے بیان کیا گیا ہے۔امام مسلم کی مرویات میں 'ردف' کا لفظ آیا ہے۔لیکن دوسری روایات میں اس کے لیے 'ردیف' کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔اور ایک روایت میں 'أردفنی' کا فعل بھی آیا ہے۔

'رحل' یعنی کجاوہ عام طور پر اونٹ پر رکھا جاتا ہے۔اس روایت کے بعض متون میں یہ تصریح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم 'عُفَیر' نامی گدھے پر سوار تھے۔یہ ممکن ہے کہ یہ لفظ محض فاصلے کو بیان کرنے کے لیے تشبیہاً آیا ہو۔اور یہ

بھی ممکن ہے کہ گدھے پر اس طرح کی کوئی چیز رکھی ہوئی ہو۔ بہر حال کجاوے کی ابھری ہوئی نوک یعنی انی کے لیے مسلم میں 'مؤخرۃ' کا لفظ آیا ہے۔ جبکہ بعض روایات میں اس کے لیے 'آخرۃ' کا لفظ اختیار کیا گیا ہے۔

کچھ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کو 'یا معاذ' کہہ کر بلایا تھا اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے پورا نام یعنی 'یا معاذ بن جبل' کہہ کر آواز دی تھی۔ اسی طرح بعض روایات میں آپ کے بار بار آواز دینے اور حضرت معاذ کے پوری طرح متوجہ ہونے کی تصریح ہے اور بعض میں نہیں ہے۔ علاوہ ازیں بعض روایات میں 'لبیك یا رسول اللّٰه و سعدیك' کا جواب نقل ہوا ہے اور بعض میں صرف اللہ اور بندوں کے حق سے متعلق سوال و جواب ہی نقل ہوئے ہیں۔ حق سے متعلق سوال و جواب کو نقل کرنے میں بھی راویوں نے دو طریقے اختیار کیے ہیں۔ کچھ رواۃ نے دونوں سوال اکٹھے کر دیے ہیں اور کچھ نے ہر سوال اور اس کے جواب کو الگ الگ بیان کیا ہے۔ عام طور پر راویوں نے روایت کے آخر میں 'أفلا أبشر الناس ...' کا جملہ روایت نہیں کیا۔

کتابیات

بخاری، رقم ۱۲۸، ۵۶۲۲، ۵۹۱۲، ۶۱۳۵۔ مسلم، رقم ۳۰۔ ابوداؤد، رقم ۲۵۵۹۔ احمد، رقم ۲۲۴۶، ۲۲۹۳، ۲۲۱۴۹، ۲۲۱۵۱۔ ابن حبان، رقم ۳۶۲۔ سنن کبریٰ، رقم ۱۱۴۔ المعجم الکبیر، رقم ۸۴، ۸۷۔ الآحاد والمثانی، رقم ۱۸۳۹، ۱۸۴۰، ۱۸۴۳۔ الادب المفرد، رقم ۹۴۳۔ مسند عبد بن حمید، رقم ۱۱۹۹۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.net

جاوید احمد غامدی

ایمانیات

دین کا بنیادی مقدمہ یہ ہے کہ دنیا کا ایک خالق ہے۔اس نے یہ دنیا امتحان کے لیے بنائی ہے۔ چنانچہ انسان کو یہاں اس نے ایک خاص مدت کے لیے بھیجا ہے۔اس مدت کے پورا ہو جانے کے بعد یہ دنیا لازماً ختم کر دی جائے گی اور اس کے زمین و آسمان ایک نئے زمین و آسمان میں تبدیل ہو جائیں گے۔ پھر ایک نئی دنیا وجود میں آئے گی۔ تمام انسان وہاں دوبارہ زندہ کیے جائیں گے اور ان کے عقیدہ وعمل کے لحاظ سے انھیں جزا یا سزا دی جائے گی۔

دین اس حقیقت کو ماننے کا مطالبہ کرتا ہے۔اس کے لیے، ظاہر ہے کہ اس کا مبرہن ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ انسان کی تخلیق کے پہلے دن ہی سے اللہ تعالیٰ نے یہ اہتمام کر رکھا ہے کہ کوئی شخص علم وعقل کی بنیاد پر اس کا انکار نہ کرے اور لوگوں کے لیے یہ حقیقت ایسی واضح رہے کہ اس کے منکرین قیامت کے دن اپنا کوئی عذر اللہ کے حضور میں پیش نہ کر سکیں۔

وجدان کی گواہی

یہ اتمام حجت کس طرح ہوا ہے؟ قرآن بتاتا ہے کہ خدا کی ربوبیت کا اقرار ایک ایسی چیز ہے جو ازل ہی سے انسان کی فطرت میں ودیعت کر دی گئی ہے۔قرآن کا بیان ہے کہ یہ معاملہ ایک عہد و میثاق کی صورت میں ہوا ہے۔ اس عہد کا ذکر قرآن ایک امر واقعہ کی حیثیت سے کرتا ہے۔انسان کو یہاں امتحان کے لیے بھیجا گیا ہے، اس لیے یہ واقعہ تو اس کی یادداشت سے محو کر دیا گیا ہے، لیکن اس کی حقیقت اس کے صفحۂ قلب پر نقش اور اس کے نہاں خانۂ دماغ

میں پیوست ہے، اسے کوئی چیز بھی محو نہیں کر سکتی۔ چنانچہ ماحول میں کوئی چیز مانع نہ ہو اور انسان کو اس کی یاددہانی کی جائے تو وہ اس کی طرف اس طرح لپکتا ہے، جس طرح بچہ ماں کی طرف لپکتا ہے، دراں حالیکہ اس نے کبھی اپنے آپ کو ماں کے پیٹ سے نکلتے ہوئے نہیں دیکھا، اور اس یقین کے ساتھ لپکتا ہے، جیسے کہ وہ پہلے ہی سے اس کو جانتا تھا۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ خدا کا یہ اقرار اس کی ایک فطری احتیاج کے تقاضے کا جواب تھا جو اس کے اندر ہی موجود تھا۔ اس نے اسے پالیا ہے تو اس کی نفسیات کے تمام تقاضوں نے بھی اس کے ساتھ ہی اپنی جگہ پالی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ انسان کے باطن کی یہ شہادت ایسی قطعی ہے کہ جہاں تک خدا کی ربوبیت کا تعلق ہے، ہر شخص مجرد اس شہادت کی بنا پر اللہ کے حضور میں جواب دہ ہے۔ فرمایا ہے:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ، وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ، اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ؟ قَالُوْا: بَلٰى، شَهِدْنَا، اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ، اَوْ تَقُوْلُوْٓا: اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ، وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْ بَعْدِهِمْ، اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ؟ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ، وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ. (الاعراف ۷: ۱۷۲-۱۷۴)

''اور یاد کرو، جب تمھارے پروردگار نے بنی آدم کی پشتوں سے اُن کی اولاد کو نکالا اور انھیں خود اُن کے اوپر گواہ بنا کر پوچھا: کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ انھوں نے جواب دیا: ضرور، آپ ہی ہمارے رب ہیں، ہم اس پر گواہی دیتے ہیں۔ یہ ہم نے اس لیے کیا کہ کہیں تم قیامت کے دن یہ نہ کہہ دو کہ ہم تو اس سے بے خبر ہی تھے یا اپنا عذر پیش کرو کہ شرک کی ابتدا تو ہمارے باپ دادا نے پہلے سے کر رکھی تھی اور ہم بعد کو اُن کی اولاد ہوئے ہیں، پھر آپ کیا ان غلط کاروں کے عمل کی پاداش میں ہمیں ہلاک کریں گے؟ (یہ ہم نے پوری وضاحت کر دی ہے) اور ہم اسی طرح اپنی آیتوں کی تفصیل کرتے ہیں، (اِس لیے کہ لوگوں پر حجت قائم ہو) اور اس لیے کہ وہ رجوع کریں۔''

یہی معاملہ خیر و شر کا ہے۔ اس کا شعور بھی اسی طرح انسان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے: 'وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا، فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا'[۱] (اور نفس گواہی دیتا ہے اور جیسا اُسے سنوارا، پھر اُس کی نیکی اور بدی اُسے سجھا دی)۔ بعض دوسرے مقامات پر یہی حقیقت 'اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ'[۲] (ہم نے اُسے خیر و شر کی راہ سجھا

---

۱ الشمس ۹۱: ۸۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

دی) اور وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ[3] '(ہم نے کیا اُسے دونوں راستے نہیں سجھائے) کے الفاظ میں واضح کی گئی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی تخلیق کے ساتھ ہی اس کے پروردگار نے ایک حاسۂ اخلاقی بھی اس کے اندر رکھ دیا ہے جو نیکی اور بدی کو بالکل اسی طرح الگ الگ پہچانتا ہے، جس طرح آنکھیں دیکھتی اور کان سنتے ہیں۔ ہمارے نفس کا یہ پہلو کہ وہ ایک نفس ملامت گر بھی ہے اور دل کے پردوں میں چھپی ہوئی اس کی زبان ایک واعظ وناصح کی طرح برائی کے ارتکاب پر ہم کو برابر ٹوکتی اور سرزنش کرتی رہتی ہے، اسی سے پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ خیروشر کا امتیاز اور خیر کے خیر اور شر کے شر ہونے کا احساس ایک عالم گیر حقیقت ہے جس کو جھٹلانے کی جسارت کوئی شخص بھی نہیں کر سکتا۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ انسان کے باطن کی اس شہادت کے بعد جزا وسزا کو جھٹلانا بھی کسی شخص کے لیے ممکن نہیں رہتا۔ فرمایا ہے:

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ، وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ، اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَجْمَعَ عِظَامَهٗ؟ بَلٰى، قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ، بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ، يَسْئَلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ، فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ وَخَسَفَ الْقَمَرُ، وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ، يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ؟ كَلَّا، لَا وَزَرَ، اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ الْمُسْتَقَرُّ، يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ، بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ، وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ. (القیٰمہ ۷۵: ۱-۱۵)

”نہیں، میں قیامت کے دن کو گواہی میں پیش کرتا ہوں، اور نہیں، میں (تمھارے) اِس نفس لوامہ کو گواہی میں پیش کرتا ہوں۔ کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ ہم اِس کی ہڈیوں کو جمع نہ کرسکیں گے؟ کیوں نہیں، ہم تو اِس کی پور پور درست کر سکتے ہیں۔ (نہیں، یہ بات نہیں)، بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) انسان اپنے ضمیر کے روبرو شرارت کرنا چاہتا ہے۔ پوچھتا ہے: قیامت کب آئے گی؟ لیکن اُس وقت، جب دیدے پتھرائیں گے اور چاند گہنائے گا اور سورج اور چاند، (یہ دونوں) اکٹھے کر دیے جائیں گے، تو یہی انسان کہے گا کہ اب کہاں بھاگ کر جاؤں ـــــ ہرگز نہیں، اب کہیں پناہ نہیں! اُس دن تیرے رب ہی کے سامنے ٹھیرنا ہوگا۔ اُس دن انسان کو بتایا جائے گا کہ اُس نے کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا ہے۔ (نہیں، وہ اِسے نہیں جھٹلا سکتا)،

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

---

[2] الدھر ۷۶: ۳۔

[3] البلد ۹۰: ۱۰۔

بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) انسان خود اپنے اوپر گواہ

ہے، اگرچہ کتنے ہی بہانے بنائے۔''

استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اپنی تفسیر میں قرآن کے اس استدلال کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اب سوال یہ ہے کہ جب انسان خود اپنے ضمیر کے اندر ایک نگران رکھتا ہے جو اس سے صادر ہو جانے والی برائیوں پر اس کو ٹوکتا رہتا ہے تو اس کے لیے یہ تصور کرنا کس طرح معقول قرار دیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک شتر بے مہار ہے، جس طرح کی زندگی وہ چاہے بسر کرے اور جس قدر چاہے اس نگران کی مخالفت کرے، لیکن کوئی اس سے باز پرس کرنے کا حق نہیں رکھتا؟ اگر انسان شتر بے مہار ہے تو یہ نفس لوامہ اس کے اندر کہاں سے آ گھسا؟ اگر اس کا خالق لوگوں کی نیکی اور بدی، دونوں سے بے تعلق ہے تو اس نے نیکی کی تحسین اور بدی پر سرزنش کے لیے انسان کے اندر یہ خلش کیوں اور کہاں سے ڈال دی؟ پھر یہیں سے یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ جب اس نے ہر انسان کے اندر یہ چھوٹی سی عدالت قائم کر رکھی ہے تو اس پورے عالم کے لیے وہ ایک ایسی عدالت کبریٰ کیوں نہ قائم کرے گا، جو سارے عالم کے اعمال خیر و شر کا احتساب کرے اور ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق جزا یا سزا دے؟ ان سوالوں پر جو شخص خواہشوں سے آزاد ہو کر غور کرے گا، وہ ان کا یہی جواب دے گا کہ بے شک، انسان کا اپنا وجود گواہ ہے کہ وہ خیر و شر کے شعور کے ساتھ پیدا ہوا ہے۔ وہ شتر بے مہار نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے لازماً ایک پرسش کا دن آنے والا ہے جس میں اس کو اس کی بدیوں کی سزا ملے گی اگر اس نے یہ بدیاں کمائی ہوں گی اور نیکیوں کا صلہ ملے گا اگر اس نے نیکیاں کی ہوں گی۔ اسی دن کی یاددہانی ہی کے لیے خالق نے اس کا ایک چھوٹا سا نمونہ خود انسان کے نفس کے اندر رکھ دیا ہے تاکہ انسان اس سے غافل نہ رہے اور اگر کبھی غفلت ہو جائے تو خود اپنے نفس کے اندر جھانک کر اس کی تصویر دیکھ لے۔ یہی حقیقت حکما اور عارفین نے یوں سمجھائی ہے کہ انسان ایک عالم اصغر ہے جس کے اندر اس عالم اکبر کا پورا عکس موجود ہے۔ اگر انسان اپنے کو صحیح طور پر پہچان لے تو وہ خدا اور آخرت، سب کو پہچان لیتا ہے۔''

(تدبر قرآن ۹/ ۸۰)

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

پروفیسر خورشید عالم

مسجد اور عورت

امام ابن حزم اندلسی کا مسلک

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

۱

امام ابن حزم کا نام علی بن احمد بن سعید بن حزم (۳۸۴۔۴۵۶) ہے۔ وہ فقہ کے امام اور مجتہد مطلق ہیں۔ وہ محدث، فقیہ، شاعر، ادیب، انساب اور ادیان و مذاہب کے ماہر ہیں۔

عورت کی امامت کے مسئلہ پر امام ابن حزم نے 'المحلی' (مطبوعہ دار الجیل بیروت) کی جلد سوم صفحہ ۱۲۹ سے صفحہ ۱۴۰ تک تفصیل سے بحث کی ہے۔ میں اس کے مختلف اجزا کا اردو ترجمہ پیش کر رہا ہوں۔ کہیں کہیں میں نے وضاحتی نوٹ دیے ہیں۔ طوالت کے خوف سے میں نے حدیث لکھتے وقت امام ابن حزم کا سلسلۂ سند حذف کر کے صرف تابعی یا صحابی راوی کا نام لکھا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ترجمہ کرتے وقت مجھے ٹھوکر لگی ہو۔ اگر کوئی صاحب علم اس کی نشان دہی کرے گا تو شکر گزار رہوں گا۔

جب یہ معلوم ہو جائے کہ عورتیں مسجد میں نماز پڑھنا چاہتی ہیں تو کسی عورت کے سرپرست اور کسی لونڈی کے آقا کے لیے جائز نہیں کہ وہ انھیں مسجد میں باجماعت نماز پڑھنے سے روکے۔ اور عورتوں کے لیے روا نہیں کہ (وہ مسجد جانے کے لیے) خوش بو لگا کر اور بڑھیا لباس پہن کر نکلیں۔ اور اگر وہ ایسا کریں تو انھیں روکا جائے۔ اور ان کی

باجماعت نماز اکیلے نماز پڑھنے سے افضل ہے۔

اس کے بعد امام موصوف نے اپنے موقف کی تائید میں نو احادیث پیش کی ہیں جن کا ترجمہ پیش خدمت ہے:

حدیث ۱۔ہم سے حدیث بیان کی... ابن عمر نے کہ اللہ کے رسول نے فرمایا: 'لا تمنعوا اماء اللّٰہ مساجد اللّٰہ' (اللہ کی بندیوں کو مسجدوں میں جانے سے نہ روکو)۔

حدیث۲: اور انھی سے مروی مسلم کی روایت ہے۔ہم سے حدیث بیان کی... سالم بن عبداللہ بن عمر نے کہ عبداللہ بن عمر نے فرمایا کہ میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا 'لا تمنعوا نساء کم المساجد اذا استاذنکم الیھا' (اگر تمھاری عورتیں تم سے مسجدوں میں جانے کی اجازت طلب کریں تو ان کو مت روکو۔) اس پر ان کے لڑکے بلال نے کہا: بخدا ہم تو انھیں ضرور روکیں گے۔ پس عبداللہ بن عمر اس کی طرف متوجہ ہوئے اور اسے سخت برا بھلا کہا۔ اتنا سخت کہ میں نے ان کو ایسا کہتے ہوئے کبھی بھی نہیں سنا۔ اور فرمایا: میں تجھے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بتا رہا ہوں اور تم کہتے ہو کہ بخدا ہم انھیں ضرور منع کریں گے۔ (یعنی رسول کی حدیث کے مقابلے میں اپنی رائے پیش کرتے ہو۔)

وضاحتی نوٹ: سنن ابی داؤد کی شرح عون المعبود (۱/ ۲۲۲) میں طبرانی کی روایت کا حوالہ دیا گیا ہے کہ اس روایت میں 'سَبّ' (برا بھلا کہا) سے مراد تین مرتبہ لعنت بھیجنا ہے۔ اور اسی کتاب میں مسند احمد کی ابن ابی نجیح کی روایت کا حوالہ دیا گیا ہے کہ اس کے بعد عبداللہ بن عمر نے جیتے جی اپنے اس لڑکے سے بات نہ کی۔

حدیث۳: انھی سے مروی مسلم کی روایت ہے۔ ہم سے حدیث بیان کی... مجاہد نے ابن عمر سے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: 'لا تمنعوا النساء من الخروج باللیل الی المساجد' (عورتوں کو رات کے وقت مسجدوں میں جانے سے مت روکو)۔

وضاحتی نوٹ: بعض علما خصوصاً احناف نے اس حدیث سے یہ دلیل لی ہے کہ مسجد کی طرف نکلنے کی اجازت رات کے وقت تھی۔ اپنی رائے کی تائید میں انھوں نے یہ عجیب وغریب منطق پیش کی ہے کہ رات کے وقت راستے خالی ہوتے ہیں۔ فاسق اپنے فسق میں مشغول ہوتے ہیں، جبکہ دن کے وقت وہ منتشر ہو جاتے ہیں۔ شارح بخاری کرمانی نے بخاری کی کتاب الجمعہ میں حضرت عمر کی بیوی کے بارے میں عبداللہ بن عمر کی روایت کے تحت اس منطق کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ اگر عورت کو رات کے وقت مسجد جانے کی اجازت ہے تو قرین قیاس یہی ہے کہ دن کے وقت ان کو لازماً اجازت دی جائے، کیونکہ رات کو فتنہ اور شرارت کا احتمال زیادہ ہوتا ہے۔ رات کا اندھیرا برائی کا

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

باعث بنتا ہے۔ دن کو روشنی میں عام لوگوں کی موجودگی کے باعث شرارت کا احتمال نسبتاً کم ہوتا ہے۔ فتح الباری میں ابن حجر عسقلانی نے بھی اسی رائے کی تائید کی ہے۔

حدیث ۴: ہم سے حدیث بیان کی... عبدالرحمان بن عوف نے ابو ہریرہ سے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: 'لا تمنعوا اماء اللّٰہ مساجد اللّٰہ و لا یخرجن الا وھن تفلات'، (اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مسجدوں میں جانے سے مت روکو اور وہ خوش بو لگا کر اور بڑھیا کپڑے پہن کر نہ نکلیں)۔

وضاحتی نوٹ: اللہ کی بندیوں اور اللہ کی مسجدوں کی ترکیب سے اس جانب اشارہ کیا گیا ہے کہ بندیاں بھی اللہ کی ہیں اور مسجدیں بھی اللہ کے گھر ہیں تو پھر کسی دوسرے کو یہ حق کیسے حاصل ہے کہ وہ اللہ کی بندیوں کو اللہ کے گھروں میں جانے سے روکے۔ گویا حدیث کا مفہوم وہی ہے جو اس آیۂ مبارکہ کا ہے: 'ومن اظلم ممن منع مساجد اللّٰہ ان یذکر فیھا اسمہ' (البقرہ ۲: ۱۱۴) ''اس سے بڑا کون ظالم ہے جو اللہ کی مسجدوں میں اس کے نام کا ذکر کیے جانے سے روکتا ہے''۔

امام علی بن حزم کا قول ہے کہ 'التفلۃ' خوش بو نہ لگانے اور عام سا لباس پہننے کو کہتے ہیں۔

حدیث ۵: ہم سے حدیث بیان کی... عبداللہ بن مسعود کی بیوی زینب نے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا: 'اذا شھدت احدا کن المسجد فلا تمس طیبا'، (جب تم میں سے کوئی مسجد میں حاضر ہو تو خوش بو نہ لگائے)۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

حدیث ۶: مالک کے سلسلۂ سند سے یحییٰ بن سعید نے عمرہ بنت عبدالرحمان سے انھوں نے ام المومنین عائشہ سے روایت کی۔ انھوں نے کہا: 'ان کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لیصلی الصبح فینصرف النساء متلففات بمروطھن ما یعرفن من الغلس'، (اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز پڑھا چکتے تو عورتیں اپنی چادروں میں لپٹی ہوئی مسجد سے نکل جاتیں اور دھندلکے کی وجہ سے کوئی ان کو پہچان نہ سکتا)۔

حدیث ۷: ہم سے حدیث بیان کی... جابر نے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: 'خیر صفوف الرجال المتقدم و شرھا المؤخر و شر صفوف النساء المتقدم و خیرھا المؤخر یا معشر النساء اذا سجد الرجال فاغضضن ابصارکن لا ترین عورات الرجال من ضیق الأزر'، (مردوں کی بہترصفیں اگلی ہیں اور بدترین پچھلی جبکہ عورتوں کی بدترین صفیں اگلی ہیں اور بہترین پچھلی۔ اے عورتوں کی جماعت، جب مرد سجدہ کریں تو اپنی نظریں جھکا لیا کرو تاکہ تہہ بند کی تنگی یا چھوٹائی کی وجہ سے تم مردوں کی شرم گاہوں کو

نہ دیکھ سکو)۔

وضاحتی نوٹ: اس وقت کپڑے کی قلت کی وجہ سے بعض لوگ ایک ہی کپڑے میں نماز پڑھتے تھے۔ وہ اپنے تہہ بند گردن میں گرہ دے کر باندھ لیا کرتے تھے۔ اس طرح سجدہ کے وقت کبھی ان کا ستر کھل جاتا تھا۔ اس لیے نبی پاک نے یہ حکم دیا۔

حدیث ۸: ہم سے حدیث بیان کی... نافع نے ابن عمر سے کہ اللہ کے رسول نے فرمایا: 'لو ترکنا ھذا الباب للنساء فلم یدخل منه ابن عمر حتی مات'، (کاش، ہم اس دروازے کو عورتوں کے لیے چھوڑ دیں۔ ابن عمر جیتے جی اس دروازے سے داخل نہیں ہوئے)۔

وضاحتی نوٹ: یہ دروازہ مسجد نبوی میں آج تک قائم ہے اور مسلمان عورتیں اس مسجد میں نماز پڑھنے کی فضیلت سے محروم نہیں ہوتیں۔

حدیث ۹: سنن ابی داؤد میں انھی سے مروی حدیث ہم سے بیان کی... (نافع نے کہ حضرت عمر بن الخطاب مردوں کو عورتوں کے دروازے سے داخل ہونے سے روکتے تھے)۔

امام علی بن حزم کا قول ہے کہ اگر عورتوں کے لیے گھروں میں نماز پڑھنا افضل ہوتا تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کو اس حالت میں نہ چھوڑتے کہ وہ ایسی مشقت اٹھائیں جو انھیں زیادہ فضیلت دینے کی بجائے فضیلت میں کمی کر دے۔ یہ تو کوئی خیر خواہی نہ ہوئی، جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے: ''دین تو نام ہی خیر خواہی کا ہے۔'' آپ کی ذات اقدس سے یہ بات بعید ہے، بلکہ آپ تو اپنی امت کے سب سے بڑھ کر خیر خواہ ہیں۔ اگر گھروں میں نماز پڑھنا افضل ہوتا تو آپ عدم ممانعت کو فرض قرار نہ دیتے اور جب آپ نے عورتوں کو خوش بو نہ لگا کر نکلنے کا حکم دیا تو یہ حکم کم از کم مستحب ہے جس میں (عورتوں کو مسجد میں نماز پڑھنے کی) ترغیب دلائی گئی ہے۔

امام ابوحنیفہ اور مالک کا قول ہے کہ اپنے گھروں میں عورتوں کی نماز افضل ہے۔ ابوحنیفہ تو نماز با جماعت، جمعہ اور عیدین کے لیے ان کا مسجدوں میں جانا مکروہ سمجھتے ہیں۔ انھوں نے خاص طور پر بوڑھی عورتوں کو (مسجد میں) عشا اور فجر کی نماز پڑھنے کی اجازت دی ہے۔ ابوحنیفہ سے ایک روایت یہ ہے کہ عیدین کے لیے ان کا نکلنا مکروہ نہیں ہے۔

(امام) مالک کا قول ہے کہ ہم ان کو مسجدوں میں جانے سے نہیں روکتے۔ انھوں نے عمر رسیدہ عورت کو عیدین اور نماز استسقا (بارش) کے لیے نکلنے کو مباح سمجھا ہے اور ان کا قول ہے کہ جوان عورت کبھی کبھی مسجد میں جائے اور انھی کا قول ہے کہ عمر رسیدہ عورت مسجد جائے، مگر کثرت سے نہ آئے جائے۔

www.javedahmadghamidi.com

امام علی بن حزم کا قول ہے کہ جس کسی نے اس بات کو اس روایت کی بنیاد پر مکروہ سمجھا ہے جو ہم نے ... حضرت عائشہ سے روایت کی ہے کہ 'لو رای رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ما احدث النساء بعدہ لمنعھن المسجد کما منعت نساء بنی اسرائیل '، (اگر رسول صلی اللہ علیہ وسلم وہ نئی نئی باتیں دیکھ لیتے جو عورتوں نے ان کے بعد ایجاد کیں تو وہ ان کو مسجد میں جانے سے ایسے روکتے جیسے بنو اسرائیل کی عورتوں کو مسجدوں میں جانے سے روکا گیا تھا)۔ تو اس نے ہنگامہ بپا کیا ہے۔

(اس نے بھی ہنگامہ بپا کیا ہے) جس نے اس بات کو اس حدیث کی بنا پر مکروہ سمجھا ہے جو عبدالحمید بن منذر انصاری نے اپنی پھوپھی (چچی) یا دادی ام حمید سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: 'ان صلاتك فی بیتك افضل من صلاتك معی '، (تیرے لیے گھر میں نماز پڑھنا میرے ساتھ نماز پڑھنے سے افضل ہے)۔

(اس نے بھی ہنگامہ بپا کیا ہے) جس نے اس بات کو اس حدیث کی وجہ سے مکروہ سمجھا ہے جو عبداللہ بن رجا غدانی کی سند سے... ابوہریرہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: 'لأن تصلی المراۃ فی مخدعھا اعظم لاجرھا من ان تصلی فی بیتھا وان تصلی فی بیتھا اعظم لاجرھا من ان تصلی فی دارھا وان تصلی فی دارھا اعظم لاجرھا من ان تصلی فی مسجد قومھا وان تصلی فی مسجد قومھا اعظم لاجرھا من ان تصلی فی مسجد جماعۃ وان تصلی فی مسجد جماعۃ خیرلھا من ان تخرج الی الصلاۃ یوم العید '، (عورت اگر اپنے شبستاں میں نماز پڑھے تو اس کا اجر گھر میں نماز پڑھنے سے زیادہ ہے اور گھر میں نماز پڑھنے کا اجر آنگن میں نماز پڑھنے سے بڑھ کر ہے اور آنگن میں نماز پڑھنے کا اجر اپنے قبیلے کی مسجد میں نماز پڑھنے سے زیادہ ہے اور قبیلے کی مسجد میں نماز پڑھنے کا اجر جامع مسجد میں نماز پڑھنے سے بڑھ کر ہے اور جامع مسجد میں نماز پڑھنا اس کے لیے عید کے دن نماز کے لیے نکلنے سے بہتر ہے)۔

بعض (فقہا) کا قول ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو عید کے دن نکلنے کا حکم محض دشمن کو ڈرانے کے لیے دیا ہو، کیونکہ مسلمان ان دنوں تعداد میں تھوڑے تھے اور ہوسکتا ہے کہ یہ حکم اس لیے دیا ہو کہ وہ دیکھنے والے کی نگاہوں میں زیادہ معلوم ہوں۔

امام علی بن حزم کا قول ہے کہ یہ بہت بڑی جسارت ہے، کیونکہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بہتان ہے اور

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

لاعلمی پر مبنی قول ہے۔ آپ نے وضاحت کر دی ہے کہ عورتوں کو نکلنے کے لیے آپ کا حکم اس لیے ہے کہ وہ بھی کار خیر اور مسلمانوں کی دعا میں شامل ہو جائیں۔ تف ہے اس پر جو اللہ کے رسول کے قول کو جھٹلاتا ہے اور اپنی رائے سے جھوٹ تراشتا ہے۔ پھر یہ قول سراسر جھوٹ ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی بے ہودہ اور ضعیف ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کوئی فوج نہ تھی کہ اس کو ڈراتے۔ سوائے منافقوں اور یہود مدینہ کے ان کا کوئی دشمن نہ تھا۔ اور وہ جانتے تھے کہ وہ عورتیں ہیں، وہ تو اس اختلاط کو حیرت اور پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔

امام علی ابن حزم کا قول ہے، رہی عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث تو کئی وجوہات کی بنا پر وہ قابل حجت نہیں۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ نبی علیہ السلام نے عورتوں کو نئی نئی باتیں پیدا کرتے ہوئے نہیں پایا تو آپ نے ان کو (مسجدوں میں جانے سے) منع بھی نہیں کیا۔ جب آپ نے ان کو منع نہیں کیا تو ان کو منع کرنا بدعت ہے، خطا ہے۔ یہ قول ایسا ہی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: 'یا نساء النبی من یات منکن بفاحشة مبینة یضاعف لها العذاب ضعفین' (الاحزاب ۳۳: ۳۰) ''اے نبی کی بیویو! جو کوئی تم میں سے کھلی بے حیائی کرے گی، اس کو دو چند سزا دی جائے گی۔''

ازواج مطہرات نے کبھی کھلی بے حیائی نہیں کی۔ اس لیے 'الحمد للّٰہ' انھیں دو چند سزا بھی نہیں ملی۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی مانند ہے کہ 'ولو ان اهل القرٰی اٰمنوا واتقوا لفتحنا علیهم برکات من السمآء والارض' (الاعراف ۷: ۹۶) ''اور اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر زمین و آسمان کی برکتیں کھول دیتے۔'' نہ وہ ایمان لائے اور نہ ہی اللہ نے ان پر برکتیں کھولیں۔ ہم اس حجت سے بڑھ کر کوئی حجت نامعقول نہیں سمجھتے، جب حجت پکڑنے والا کہنے والے کے اس قول سے حجت پکڑے کہ اگر یوں ہوتا تو یوں ہوتا اور اس سے اس چیز کو واجب قرار دے جو ابھی ہوئی نہیں، اگر ایک چیز ہوتی تو دوسری بھی ہوتی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تو جانتا تھا کہ عورتیں کیا کیا نئی باتیں ایجاد کرنے والی ہیں۔ جو اللہ کے اس علم کا انکار کرے، وہ تو کافر ہے پھر بھی اللہ نے اپنے نبی کو وحی نہیں کی کہ ان کو مسجد جانے سے روک دیا جائے، کیونکہ وہ نئے نئے کام کرنے والیاں ہیں اور نہ کبھی اللہ نے ان کی طرف وحی کی کہ لوگوں کو بتا دو کہ اگر عورتوں نے نئی باتیں ایجاد کیں تو انھیں مسجد جانے سے روک دیں۔ اگر اللہ نے ایسا نہیں کیا تو اس قسم کے قول سے وابستگی عیب ہے، خطا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ ہم نہیں جانتے کہ عورتوں نے کون سی ایسی نئی باتیں کیں جو انھوں نے عہد رسالت میں نہیں کی تھیں۔ نئی باتوں میں زنا سے بڑھ کر تو کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی۔ یہ تو عہد رسالت میں بھی ہوتا رہا جس پر رجم اور

کوڑوں کی سزا دی گئی۔ اس سبب کی وجہ سے تو کبھی عورتوں کو مسجد میں جانے سے نہ روکا گیا۔ زنا جیسا کہ عورتوں کے لیے حرام ہے بالکل اسی طرح مردوں پر بھی حرام ہے۔ اس میں قطعی کوئی فرق نہیں۔ کون ہے جو زنا کو عورتوں کے مسجد جانے سے روکنے کا سبب گردانتا ہے اور اسے مردوں کو مسجد جانے سے روکنے کا سبب نہیں گردانتا؟ یہ ایک ایسی توجیہ ہے، جسے نہ اللہ پسند کرتا ہے نہ اللہ کا رسول۔

(باقی)

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

خالد مسعود

مرکز توحید کی تعمیر اور دعائے ابراہیم

[جناب خالد مسعود صاحب کی تصنیف ''حیات رسول امی'' سے انتخاب]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے وہ رسول ہیں جن کے آہنی عزم، مضبوط کردار، اللہ کی وحدانیت کے اثبات کے لیے سرفروشانہ جذبہ اور ان کے اہم عملی اقدامات کو بنی آدم کے لیے بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ ان کو اللہ رب العزت کے لیے اپنی عبودیت اور وفاداری کا ثبوت غیر معمولی طور پر سخت امتحانوں سے گزر کر پیش کرنا پڑا۔ جب وہ ہر آزمایش میں کامیاب رہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو تمام انسانوں کے امام و رہنما کی حیثیت عطا فرمائی۔ ہزاروں برس گزر جانے کے باوجود یہود، نصاریٰ اور مسلمان ان کو اپنا پیشوا مانتے اور ان کے لیے عقیدت کے جذبات رکھتے ہیں۔ ان کی نسل میں اتنی کثیر تعداد میں انبیا و رسل پیدا ہوئے کہ ان کو ابوالانبیا یعنی نبیوں کے جد اعلیٰ کا لقب دیا گیا ہے۔

اہل تحقیق کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آبا و اجداد اصلاً عرب کے باشندے تھے جو نقل مکانی کر کے دجلہ و فرات کی زرخیز سرزمین کے مشہور شہر بابل میں آباد ہو گئے۔ یہ علاقہ آہستہ آہستہ شرک، بت پرستی اور کواکب پرستی کا گڑھ بن گیا۔ یہاں تک کہ عرب سے آنے والے لوگ بھی اسی مذہب کے پیرو بن گئے۔ مشہور روایت کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد آزر شہر کے بڑے بت خانہ کے ایک ذمہ دار فرد تھے، لیکن بیٹے کو بت پرستی سے سخت نفرت رہی اور وہ اس کے خلاف آواز بلند کرتے رہے۔ قوم کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو رسول مبعوث کیا۔ انھوں نے اپنے والد اور اعزہ کو اللہ کی وحدانیت کا درس دیا اور شرک کو رب سے

بغاوت قرار دیا، لیکن بجائے اس کے کہ وہ کوئی اثر قبول کرتے، والد نے ان کو گھر چھوڑنے کا الٹی میٹم دے دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعوت قوم کے سامنے رکھی اور استدلال کے اچھوتے اسلوب اختیار کیے جنھوں نے قوم کو لاجواب کر دیا۔ انھوں نے بادشاہ وقت کو بھی اپنی دعوت سے روشناس کرایا اور اس کے مناظرانہ دلائل کا ایسا توڑ کیا کہ اس سے کوئی جواب بن نہ آیا[1]۔ تاہم ان کی بیوی سارہ اور ایک بھتیجے لوط کے سوا کسی نے ان کی دعوت پر کان نہیں دھرے۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قوم کے رویہ سے مایوسی ہوئی تو آخری حربہ کے طور پر انھوں نے عظیم خطرہ مول لے کر قوم کو سبق سکھانے کا فیصلہ کیا۔ ایک ایسی شب میں کہ جب لوگ کوئی تہوار منانے میں مصروف تھے، وہ مرکزی بت کدہ کو خالی پا کر اس میں داخل ہوئے اور اس میں رکھے ہوئے بڑے بت کے سوا باقی تمام بتوں کو توڑ دیا۔ صبح کو جب پجاری بت کدے میں داخل ہوئے اور بتوں کا حال دیکھا تو سوال پیدا ہوا کہ یہ حرکت کس نے کی ہے۔

ان کو خیال ہوا کہ ہو نہ ہو، یہ حرکت ابراہیم نے کی ہوگی، کیونکہ وہ بت پرستی کے خلاف بہت بولتا رہتا ہے۔ جب ابراہیم علیہ السلام سے جواب طلبی کی گئی تو انھوں نے بڑے بت کی طرف اشارہ کیا کہ یہ سلامت ہے، اسی سے پوچھ لو کہ دوسرے بتوں کو کس نے توڑا ہے۔ اس پر اصل حقیقت لوگوں کی زبان سے ادا ہوگئی۔ وہ کہنے لگے کہ تم جانتے ہو، یہ بت بول نہیں سکتے۔ ابراہیم علیہ السلام کو موقع مل گیا تو انھوں نے قوم کے آگے توحید کے حق میں اور شرک کے خلاف تقریر کر دی کہ جب یہ بت نہ بول سکتے اور نہ اپنا دفاع کرنے پر قادر ہیں تو یہ تمھارے لیے کیسے نفع یا ضرر پہنچانے والے بن سکتے ہیں۔ حقیقی معبود صرف اللہ ہے جو ہر شے پر قدرت رکھتا ہے۔ شرک کے خلاف اس عملی مظاہرہ کا قوم کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اندھے بہرے تعصب میں مبتلا ان لوگوں نے ابراہیم علیہ السلام کو گردن زدنی قرار دیتے ہوئے ان کو آگ میں جلانے کی سزا تجویز کی۔ اپنے طور پر انھوں نے آگ بھڑکا کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جلانے کی تدبیر کی، لیکن اللہ تعالیٰ نے بروقت اس کو ٹھنڈا کر دیا اور ابراہیم علیہ السلام آگ سے محفوظ رہے[2]۔ اس کے بعد ان کو بابل سے ہجرت کا حکم ہوا اور وہ اپنی بیوی سارہ اور بھتیجے لوط کے ہمراہ شہر سے نکل گئے۔ ان کے نکل جانے کے بعد شہر پر عذاب نازل ہوا۔

---

[1] سورۂ بقرہ ۲: ۲۵۸

[2] سورۂ صافات ۳۷: ۸۳۔ ۱۰۰۔

دین کی خاطر اپنے وطن مألوف کو خیر باد کہہ کر کسی نئے علاقہ میں جا کر از سر نو زندگی کی جدوجہد شروع کرنا ہجرت کہلاتا ہے۔ یہ ایک بڑی آزمایش ہوتی ہے۔ اس لیے جب اللہ کے بندے یہ عظیم قربانی دیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان پر خصوصی نظر کرم فرماتا اور ان کے لیے نئے امکانات پیدا کرتا ہے۔ یہی کچھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ہوا۔ وہ مختلف علاقوں میں سے گزرتے ہوئے عرب کے شمال میں پہنچے اور اپنے لیے کنعان (موجودہ اسرائیل) کا علاقہ بطور مسکن چنا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے مال میں برکت دی۔ بھیڑ بکریوں میں افزایش ہوئی اور جلد ہی ان کا شمار علاقے کے رئیسوں میں ہونے لگا۔ شمالی عرب میں بنو قحطان کی ریاستیں تھیں۔ یہ عرب قبیلہ مروت، فیاضی اور مہمان نوازی کے لیے مشہور تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جس جگہ آباد ہوئے، وہ بنو جرہم کے سردار ابوملک کے زیر اثر تھی۔ ابوملک کے تعلقات ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ بہت اچھے تھے۔ اس نے ان کی بڑی مدارات کی[۳]۔ ان کو اپنا حلیف بنایا اور عرب قبائل کے رواج کے مطابق ان حلیفانہ تعلقات کے استحکام کے لیے اپنی بیٹی ہاجرہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نکاح میں دے دیا۔ پچاسی برس کی عمر تک حضرت ابراہیم علیہ السلام لاولد رہے۔ بالآخر ان کو ایک حلیم الطبع فرزند عطا کیے جانے کی بشارت ہوئی۔ یہ بیٹا ہاجرہ کے بطن سے پیدا ہوا اور اس کا نام اسماعیل رکھا گیا۔ یہ بیٹا قول و فعل میں سچا، صابر اور اپنے والد کی اعلیٰ صفات کا مظہر تھا۔ یہ اکلوتا فرزند والدین کی دل جمعی کا ذریعہ اور ان کی امیدوں کا مرکز بن گیا۔

یہودیوں نے نسلی تعصب کی بنا پر ہاجرہ کی تحقیر کے لیے ان کو ابراہیم علیہ السلام کی پہلی بیوی سارہ کی مصری لونڈی

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

۳؎ تورات کی کتاب پیدائش کے باب ۲۰ میں بیان ہوا ہے کہ ابوملک جرار کا بادشاہ تھا۔ یہ علاقہ کنعان کے جنوب میں تھا۔ ابراہیم ابوملک سے ملے تو ان کو رخصت کرتے وقت اس نے بھیڑ بکریاں، گائے بیل، غلام اور لونڈیاں ان کو پیش کیں اور کہا کہ میرا ملک آپ کے سامنے ہے، جہاں جی چاہے رہو۔

اس باب میں حضرت ابراہیم کا اپنی بیوی سارہ کو بادشاہ کے حرم میں بھیجنے کا واقعہ ابوملک کے تعلق سے بیان کیا گیا ہے جبکہ بعینہٖ انھی تفصیلات کے ساتھ یہ واقعہ باب ۱۲ میں فرعون شاہ مصر کے حوالہ سے بیان ہوا ہے۔ یہ بالکل ناممکن ہے کہ سارہ دو مرتبہ ایک جیسے امتحان سے گزری ہوں اور دونوں مرتبہ اس کی تفصیلات بھی یکساں رہی ہوں۔ چونکہ عرب ابوملک کو قبیلہ جرہم کا سردار مانتے ہیں جو حضرت اسماعیل کے سسرال بھی تھے، اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ واقعہ ابوملک کے کردار کو مسخ کرنے کے لیے گھڑا گیا اور ہاجرہ کی ولدیت کے معاملہ میں خلط مبحث سے کام لیا گیا۔

بتایا ہے، لیکن قرائن سے اس کی نفی ہوتی ہے۔ ابوملک نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جہاں مدارات کی اور دنیاوی مال و متاع دیا وہیں اس کی عقیدت کا یہ حال تھا کہ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ 'ہر کام میں جو تو کرتا ہے خدا تیرے ساتھ ہے'۔ اس صورت میں عربوں کے طریقہ پر اس کا اپنی بیٹی سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے بیاہ دینا بعید نہیں۔ خود ہاجرہ نے زندگی بھر اپنا تعلق بنوجرہم کے ساتھ باقی رکھا، اپنے بیٹے اسماعیل اور ان کی اولاد کی شادیاں اسی قبیلہ میں کیں، اور یہ تعلق اتنا مضبوط ہوا کہ بنوجرہم مکہ میں آباد ہو گئے اور بعد کے ادوار میں بیت اللہ کا نظم و نسق تک بنوجرہم کے ہاتھ میں آ گیا۔ اگر ہاجرہ فی الواقع مصری خاتون ہوتیں تو انھیں بنوجرہم کے ساتھ وابستہ رہنے اور رشتہ داریاں قائم کرنے کی کیا ضرورت تھی[۴]۔

محبوب فرزند کی قربانی

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا محبوب فرزند جب ان کا ہاتھ بٹانے کے لائق ہو گیا تو ان کو ایک ایسی آزمایش میں مبتلا کیا گیا جس کی کوئی نظیر انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ان کو حکم ہوا کہ ہاجرہ اور بیٹے کو ساتھ لے کر جنوب کو روانہ ہوں۔ تورات کے بیان کے مطابق یہ سفر 'بیت ایل' پر جا کر ختم ہوا جہاں انھوں نے قربان گاہ بنائی۔ بیت ایل کے لفظی معنی بیت اللہ کے ہیں۔ آثار و قرائن اس بات کے حق میں ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام جنوب کی طرف سفر کرتے ہوئے وادی بطحا میں پہنچے جہاں اس وقت مکہ مکرمہ واقع ہے۔ اس میں بیت اللہ بھی موجود ہے اور قربان گاہ مروہ بھی۔ مکہ کا ابتدائی نام بکہ تھا جو بابلی زبان میں آبادی یا شہر کے معنی میں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وادی میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آمد کے بعد جو گھر آباد ہوئے ہوں گے، ان کے لیے انھوں نے اپنے پہلے وطن اور وہاں کی

۴؎ قاضی سلیمان منصور پوری نے یہودی مفسر تورات ربی شلوموکی تحقیق یوں بیان کی ہے کہ ہاجرہ فرعون مصر کی بیٹی تھی۔ اس نے سارہ کی خدمت کے لیے اس بیٹی کو ان کے ساتھ کر دیا اور کہا کہ اس کا سارہ کے ہاں خادمہ ہو کر رہنا دوسرے گھر میں ملکہ ہو کر رہنے سے بہتر ہے۔ اس محقق کے نزدیک ہاجرہ لونڈی نہیں، بلکہ بادشاہ کی بیٹی تھیں۔

ابوملک عربی نام ہے۔ اس کی ریاست بھی کنعان کے جنوب یعنی ملک عرب ہی میں بتائی گئی ہے جبکہ مصر کنعان سے مغرب کو ہے۔ صاحب تفسیر نظام القرآن حمید الدین فراہی نے اسیریا کے کتبوں کے حوالہ سے بتایا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام جس مصر سے گزرے وہ کنعان کے جنوب میں عرب کا شمالی و مغربی حصہ ہے نہ کہ مصر نیل۔ ان کے نزدیک ہاجرہ ابوملک کی بیٹی تھیں۔ (دیکھیے آنحضرت کا سلسلۂ نسب اور اہل کتاب، حمید الدین فراہی۔ مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی۔ ۱۹۹۱ء)

زبان کے لحاظ سے نام 'بکہ' تجویز کیا ہوگا جو امتداد زمانہ کے ساتھ مکہ میں بدل گیا۔قرآن میں مکہ کے لیے یہی قدیم نام استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّ ھُدًی لِّلۡعٰلَمِیۡنَ . فِیۡہِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبۡرٰہِیۡمَ.

(آل عمران ۳: ۹۶-۹۷)

''بے شک پہلا گھر جو لوگوں کے لیے مقرر کیا گیا وہی ہے جو بکہ میں ہے، جہان والوں کے لیے برکت اور ہدایت کا مرکز۔ اس میں واضح نشانیاں ہیں۔ وہ مسکن ابراہیم ہے۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے فرزند کو اللہ کی راہ میں قربان کر رہے ہیں۔ وہ جس عزم و حوصلہ کے مالک تھے، اس نے انھیں خواب کی کوئی توجیہ و تعبیر کرنے سے باز رکھا اور خواب کے ظاہر کے مطابق انھوں نے اسماعیل کو قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جب بیٹے سے اپنے ارادہ کا ذکر کیا تو اس نے نہایت سعادت مندی سے منشائے الٰہی پورا کرنے کے لیے سر تسلیم خم کر دیا۔ ابراہیم اس کو مروہ پر لے گئے اور لٹا کر حلقوم پر چھری چلانا ہی چاہتے تھے کہ حکم ہوا، ابراہیم! بس کر دو، تم نے اپنا خواب سچ کر دکھایا۔ بیٹے کو واقعی ذبح کرنا مطلوب نہیں ہے۔ اس کے فدیہ کے طور پر ایک جانور ذبح کر و اور ہم اس واقعہ کی یادگار ایک عظیم رسم قربانی کو بنائیں گے جو رہتی دنیا تک باقی رہے گی۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

توحید پر کامل یقین اور اس کے لیے مکمل یکسوئی، شرک کے تمام مظاہر سے انتہائی درجہ کی بے زاری، رب کی اطاعت و نیازمندی کا جذبۂ فراواں، اور رضائے الٰہی کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہ کرنے کا حوصلہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کردار کی پہچان بن گیا۔ اللہ رب العزت نے اس کو بڑی پذیرائی بخشی، اس کو 'ملت ابراہیم' یعنی ابراہیمی طریقہ قرار دیا اور اسلام کی حقیقت کی عملی تعبیر کے لیے ابراہیم علیہ السلام کے عمل کو بطور مثال پیش کیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام بیٹے کی قربانی کے امتحان میں کامیاب رہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو مزید نوازا اور ان کو پہلی بیوی سارہ کے بطن سے ایک فرزند اسحاق کی ولادت اور اسحاق کی نسل میں ان کے بیٹے یعقوب کے تولد ہونے کی بشارت ہوئی۔ یہ بشارت سن کر ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے بے ساختہ یہ جملہ نکلا کہ 'کاش: اسماعیل ہی تیرے حضور جیتا رہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا کہ:

''اسماعیل کے حق میں میں نے تیری دعا سنی۔ دیکھ، میں اسے برکت دوں گا اور اسے برومند کروں گا اور اسے

بہت بڑھاؤں گا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اسے بڑی قوم بناؤں گا۔'' (پیدایش ۱۷: ۱۸۔۲۰)

عہد نامہ قدیم میں قربانی کے واقعہ کے بعد اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ بھی نقل ہوا ہے:

''چونکہ تو نے یہ کام کیا کہ اپنے بیٹے کو، جو تیرا اکلوتا ہے، دریغ نہ رکھا، اس لیے میں نے بھی اپنی ذات کی قسم کھائی ہے کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا اور تیری نسل کو بڑھاتے بڑھاتے آسمان کے تاروں اور سمندر کے کنارے کی ریت کی مانند کر دوں گا، اور تیری اولاد اپنے دشمنوں کے پھاٹک کی مالک ہوگی اور تیری نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی کیونکہ تو نے میری بات مانی۔'' (پیدایش ۲۲: ۱۶۔۱۸)

عہد نامہ قدیم میں یہ وعدہ وہاں نقل ہوا ہے جہاں اس سے قبل حضرت اسحاق علیہ السلام کے ذبیح ہونے کا بیان ہے۔ چنانچہ یہود و نصاریٰ اس وعدہ کو ان پر اور ان کی اولاد پر منطبق کرتے ہیں، حالانکہ وہ اس عبارت کا کسی طرح مصداق نہیں ہو سکتے۔ اس کی وجوہات حسب ذیل ہیں:

۱۔ یہاں ذبیح بیٹے کو اکلوتا بتایا گیا ہے، جبکہ حضرت اسحاق علیہ السلام اپنے بھائی حضرت اسماعیل علیہ السلام سے تقریباً چودہ برس چھوٹے تھے۔ اس لیے وہ کسی طرح اکلوتے نہیں کہلا سکتے۔ قرآن مجید نے جہاں واقعۂ ذبح بیان کیا ہے وہاں دوسرے بیٹے کے تولد کی بشارت کو پہلے بیٹے کو ذبح کے لیے پیش کر دینے کا صلہ قرار دیا ہے۔ لہٰذا مذکورہ بالا وعدہ حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی نسل کے لیے ہے۔

۲۔ اولاد اسحاق میں کبھی وہ غیر معمولی اضافہ نہیں ہوا جو 'برکت پر برکت' کا تقاضا معلوم ہوتا ہے۔ آج اکیسویں صدی عیسوی میں بھی دنیا بھر کے بنی اسرائیل کی تعداد، جو اولاد اسحاق ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، لاکھوں میں شمار ہوتی ہے، جبکہ اولاد اسماعیل پہلے ملک عرب کے کونے کونے میں اور پھر اس ملک کی حدود سے نکل کر اکناف عالم تک پھیل گئی۔ اس کی تعداد کروڑوں میں ہے۔

۳۔ اولاد اسحاق کو بہت کم دشمنوں پر غلبہ حاصل ہوا ہے۔ ان کی حکومت محدود مدت تک اور محدود علاقے میں قائم ہو سکی۔ بالعموم وہ دوسروں کے دست نگر رہے حتیٰ کہ تاریخ میں کئی بار ان کو غلامی کی ذلت سہنی پڑی۔ اس کے برعکس اولاد اسماعیل ہمیشہ آزاد رہی۔ ابتدا میں ان کی حکومتیں پورے عرب میں قائم ہوئیں، بعد ازاں دوسری قوموں کو بھی انھوں نے مغلوب کیا اور فی الواقع دشمنوں کے پھاٹک پر قابض ہوئے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ نے برکت کا وسیلہ پہلے بنی اسرائیل (جو اولاد اسحاق ہیں) کو بنایا، لیکن انھوں نے اس کو اپنا استحقاق سمجھ لیا اور دوسری اقوام کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ برکت، جو آسمانی ہدایت کی

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

شکل میں ان کے سپرد کی گئی تھی، دوسری اقوام تک نہ پہنچ سکی اور بنی اسرائیل اس پر مار گنج بن کر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد بنو اسماعیل کو یہی فریضہ سونپا گیا تو انھوں نے نہ صرف خود اس سے فائدہ اٹھایا، بلکہ سو سال کے اندر ہندوستان اور چین سے لے کر سپین و پرتگال تک کے علاقے میں بسنے والی تمام اقوام کو اس برکت میں اپنے ساتھ شریک کر لیا۔

لہٰذا مذکورہ بالا اقتباس میں ذبیح کا اشارہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرف ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ کیا گیا وعدۂ خداوندی بھی انھی کی اولاد کے بارے میں پورا ہوا۔ تورات میں اس موقع پر حضرت اسحاق علیہ السلام کا نام داخل کرنا تحریف کا کرشمہ ہے جس سے تورات کبھی محفوظ نہیں رہ سکی[5]۔ متعدد زمینی حقائق بھی اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ قربانی کا واقعہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا۔ مثلاً یہ کہ قربانی کی عبادت کا دنیا میں سب سے بڑا مرکز ہمیشہ سے مکہ چلا آ رہا ہے۔ وہیں مروہ کی قربان گاہ واقع ہے۔ بیت اللہ، جس کی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی، مکہ میں ہے اور اولاد اسماعیل کا تعلق اس معبد کے ساتھ کسی زمانہ میں ختم نہیں ہوا۔ عبادات کا جو نظام حج وعمرہ کی شکل میں حضرت ابراہیمؑ نے جاری کیا تھا، وہ ہزاروں برس گزر جانے کے باوجود اب تک قائم ہے۔ اولاد اسحاق کے ہاں ایسی کوئی نشانی محفوظ نہیں جس سے وہ اپنا تعلق واقعہ قربانی یا تعمیر بیت اللہ کے ساتھ ثابت کر سکیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

مرکز توحید کی تعمیر

ذبح سے متعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خواب کی حقیقی تعبیر، جو بعد میں ملنے والی آسمانی ہدایات سے واضح ہوئی، یہ تھی کہ وادی بطحاء میں وہ ایک معبد خاص اللہ کی عبادت کے لیے تعمیر کریں اور اس کی حفاظت و خدمت کے لیے بیٹے کو اللہ کی نذر کر دیں تاکہ وہ اس مقدس گھر کی زیارت کے لیے آنے والوں اور یہاں عبادت کرنے والوں کے لیے اس کو پاک وصاف رکھیں۔ ایک روایت کے مطابق وادی میں ایک قدیمی معبد پہلے سے موجود تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اسی کی تعمیر نو کا حکم ہوا، لیکن اس روایت کے حق میں کوئی شہادت نہیں ہے۔ اول تو 'بکہ' کا لفظ ہی بتاتا ہے کہ وادی میں پہلے کوئی آبادی نہ تھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام یہاں تشریف لائے تو ان کی آمد سے اس بستی کا

---

5. اس موضوع پر نہایت جامع اور مدلل کتاب ''الرای الصحیح فی من ھو الذبیح'' مؤلفہ حمید الدین فراہی ہے۔ جس کا ترجمہ 'ذبیح کون ہے؟' کے نام سے مولانا امین احسن اصلاحی نے کیا۔ (شائع کردہ: فاران فاؤنڈیشن لاہور)

آغاز ہوا اور انھوں نے بابلی زبان کا لفظ اس کے نام کے لیے منتخب کیا۔ اگر پہلے یہاں لوگ ہی آباد نہ تھے تو ان کے بغیر بیابان میں آخر معبد کس مقصد سے تعمیر ہوا۔ دوسرے قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تعمیر کردہ بیت اللہ ہی کو بیت العتیق (قدیمی گھر) کہا گیا ہے۔ اسی طرح قرآن نے اول بیت وضع للناس (پہلا گھر جو لوگوں کے لیے مقرر ہوا) کے الفاظ جہاں استعمال کیے ہیں وہاں اس کو 'مقام ابراہیم' (ابراہیم کا مسکن) بھی کہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان الفاظ میں جس اولیت اور قدامت کا ذکر ہوا ہے، وہ یروشلم میں واقع بیت المقدس کے مقابلہ میں ہے جو صدیوں بعد سلیمان علیہ السلام کے عہد حکومت میں تعمیر ہوا اور یہود کے ہاں اس کو قبلہ کی حیثیت حاصل ہوئی۔

دعائے ابراہیم

حکم خداوندی کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسماعیل علیہ السلام کو ساتھ لیا اور اللہ کے گھر کی تعمیر میں لگ گئے۔ جب باپ بیٹا دونوں تعمیر میں مصروف ہوتے تو اس مقدس کام کے دوران میں یہ دعا کرتے:

رَبَّنَا وَاجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَيۡنِ لَكَ وَمِنۡ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسۡلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبۡ عَلَيۡنَا اِنَّكَ اَنۡتَ التَّوَّابُ الرَّحِيۡمُ. رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَيُزَكِّيۡهِمۡ. اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ.
(البقرہ ۲: ۱۲۸۔۱۲۹)

''اے ہمارے رب! ہم دونوں کو تو اپنا مسلم (فرمانبردار و اطاعت شعار) بنا اور ہماری ذریت میں سے اپنی ایک فرمانبردار امت اٹھا، اور ہمیں ہمارے عبادت کے طریقے بتا اور ہماری توبہ قبول فرما۔ بے شک تو توبہ قبول کرنے والا رحم فرمانے والا ہے۔ اور اے ہمارے رب! تو ان میں انھی میں سے ایک رسول مبعوث فرما جو ان کو تیری آیتیں سنائے، اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔ بے شک تو غالب اور حکمت والا ہے۔''

یہ عظیم باپ بیٹا، جن کا ہر عمل اسلام کی روح سے دوسروں کو آشنا کرنے والا ہے، سب سے پہلے اپنے اسلام اور کامل فرماں برداری کی دعا کرتے، اس لیے کہ اسلام کے درجات و مراتب کی کوئی حد نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی نسل کی خیر خواہی میں اس کے اندر ایک امت مسلمہ کے اٹھائے جانے کی التجا کرتے جو ان باپ بیٹا کی روش پر چلنے والی ہو، وہ اپنے رب کی وحدانیت پر کامل یقین رکھنے والی، فرامین الٰہی پر دل و جان سے کاربند اور یک سوئی کے ساتھ رب کی اطاعت شعار ہو۔ اس کے بعد وہ اپنی نسل میں ایک ایسے رسول کے مبعوث کیے جانے کی درخواست

www.javedahmadghamidi.com

کرتے جس کے پاس اللہ کا کلام ہو، وہ امت مسلمہ کو کتاب الٰہی اور حکمت دین کی تعلیم دے، اس کا تزکیہ کرے اور ان کے اخلاق و کردار کو سنوارے۔ یہ دعا چونکہ بیت اللہ کے دونوں معزز و محترم معماروں نے مل کر اپنی اولاد کے حق میں کی، اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ اولاد اس میں شامل نہیں ہو سکتی جوان کے دوسرے بیٹے اسحاق علیہ السلام کی نسل سے تھی۔ اس دعا کے مطابق امت مسلمہ اصلاً بنو اسماعیل پر مشتمل ہونی تھی اور اس رسول کی بعثت کہ جس کے بھیجے جانے کی آرزو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کی، بنو اسماعیل ہی میں ہونی تھی۔

حضرت اسماعیل کی ذمہ داریاں

مکہ کے مرکز توحید کی تعمیر مکمل ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے دعائے ابراہیم علیہ السلام کے پہلے حصہ کو قبول فرماتے ہوئے انھیں عبادت کے احکام عطا کیے۔ ہدایت ہوئی کہ بیت اللہ تمام ذریت ابراہیم علیہ السلام کا مرکز اور قبلہ ہوگا۔ اپنی عبادات میں وہ اس گھر کا رخ کریں گے۔ اس گھر کی خاص عبادات نماز، اعتکاف، طواف کعبہ، حج اور قربانی ہوں گی۔ باپ بیٹے کو ان عبادات کے ادا کرنے کے طریقے اور مناسک سکھائے گئے۔ اس سلسلہ میں قرآن مجید میں یوں بیان ہوا ہے:

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا. وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى. وَ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ. (البقرہ ۲: ۱۲۵)

''اور یاد کرو جب ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لیے مرکز اور امن کی جگہ بنایا اور حکم دیا کہ مسکن ابراہیم میں ایک نماز کی جگہ بناؤ اور ابراہیم اور اسماعیل کو ذمہ دار بنایا کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔''

وَاَذِّنْ فِى النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَ يَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِىْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ فَكُلُوْا مِنْهَا وَ

''اور لوگوں میں حج کی منادی کرو، وہ تمھارے پاس آئیں گے پیادہ بھی اور نہایت لاغر اونٹنیوں پر بھی جو دور دراز گہرے پہاڑی راستوں سے پہنچیں گی، تاکہ لوگ اپنی منفعت کی جگہوں پر بھی پہنچیں اور چند خاص دنوں میں ان چوپایوں پر اللہ کا نام بھی لیں جو اس نے

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

اَطۡعِمُوا الۡبَآئِسَ الۡفَقِیۡرَ. ثُمَّ لۡیَقۡضُوۡا تَفَثَهُمۡ وَلۡیُوۡفُوۡا نُذُوۡرَهُمۡ وَلۡیَطَّوَّفُوۡا بِالۡبَیۡتِ الۡعَتِیۡقِ. (الحج ۲۲: ۲۷۔۲۹)

ان کو بخشے ہیں۔ پس اس میں سے کھاؤ اور فاقہ کش فقیروں کو کھلاؤ۔ پھر وہ اپنے میل کچیل دور کریں، اپنی نذریں پوری کریں اور قدیم گھر کا طواف کریں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو جو بیت اللہ کی نذر کیا گیا تو ان کی ذمہ داری یہ ٹھہری کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تعمیر کردہ اللہ کے اس گھر کو کبھی بت پرستی کا اڈا نہ بننے دیں۔ اس کی حیثیت توحید کے ایک مرکز کی ہو جہاں آ کر لوگوں کو اللہ واحد سے لو لگانے، اس سے اپنا تعلق استوار کرنے اور یک سوئی کے ساتھ اس کی خاص عبادات کا موقع ملے۔ لہٰذا اسماعیل علیہ السلام اس کو طواف کرنے والوں اور نماز ادا کرنے والوں کے لیے پاک وصاف رکھیں۔ وہ مکہ اور اس کے گردونواح میں بسنے والے لوگوں کو حج پر آنے کی دعوت دیں اور معین ایام میں حج وعمرہ پر آنے والوں کو سہولتیں فراہم کریں۔ ان کو مناسک حج سکھائیں اور اللہ کی راہ میں جانور قربان کرنے کی رسم ڈالیں۔ یہ لوگ جب سفر کا میل کچیل اتار لیں، خدا کی نذر کے جانور ذبح کر لیں اور بیت اللہ کا طواف کر لیں تو ان کا حج مکمل ہو جائے گا۔ یہ بشارت بھی دی گئی کہ جب حج کی منادی کی جائے گی تو لوگ ذوق وشوق سے اس مرکز کی طرف جمع ہوں گے اور راستوں کی دوری کی پروا بھی نہیں کریں گے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ان ہدایات سے یہ بات از خود ثابت ہو جاتی ہے کہ عرب کے دوسرے قبائل کی نسبت اولاد ابراہیم علیہ السلام، خواہ وہ بنو اسماعیل ہوں یا بنو اسرائیل، ان احکام کی اولین مخاطب تھی۔ لہٰذا شروع شروع میں بنی اسرائیل بھی اسی مرکز سے وابستہ رہے ہوں گے، ان میں حج کی عبادت رائج رہی ہوگی اور وہ نذر کی قربانیاں مکہ میں آ کر کرتے ہوں گے۔ نیز اس دور میں بیت اللہ ہی ان کی نمازوں کا قبلہ رہا ہوگا۔ اس کی تائید تورات کے اس جملہ سے ہوتی ہے کہ ''اسماعیل اپنے سب بھائیوں کے سامنے بسا رہے گا''۔ (پیدائش ۱۶: ۱۲) چونکہ ابراہیم علیہ السلام کی نسل پھیل کر عرب کے مختلف علاقوں میں جا بسی اس لیے اسماعیل علیہ السلام کا سب بھائیوں کے سامنے بسنا اسی صورت میں ممکن ہے جب ان کا مسکن سب کا قبلہ ہو اور وہ اس کی یہ حیثیت تسلیم کرتے رہے ہوں۔ لہٰذا بنی اسرائیل کا اصلی وقدیمی قبلہ بھی مکہ مکرمہ کا بیت اللہ رہا ہوگا۔ اس بات کی تائید بنی اسرائیل کے خیمۂ عبادت اور بعد میں بیت المقدس کی تعمیر کی تفصیلات سے بھی ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں خیمۂ عبادت کی ہیئت اور اس کے بارے میں احکام پر بحث کرتے ہوئے حمید الدین فراہی لکھتے ہیں:

''ہمارے نزدیک اس ساری ترتیب کا اصلی فلسفہ یہ ہے کہ جو شخص خداوند کے حضور آئے اس کا رخ جانب جنوب

یعنی مکہ معظّمہ اور ابراہیمی قربان گاہ کی طرف ہو۔ اس کی مزید تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ خیمہ کے اندر مسکن مقدس بھی جنوب ہی کی سمت میں تھا اور مذبح اس کے سامنے دروازے کی طرف تھا۔ اس لیے جو شخص وہ قربانی پیش کرتا جس کو قدس الاقداس کہتے ہیں وہ مذبح کے شمالی جانب کھڑا ہوتا تاکہ اس کا رخ مسکن ربانی کی طرف ہو سکے، جس کے معنی یہ تھے کہ اس کا رخ لازماً خانہ کعبہ کی طرف ہوتا جس کے پاس ہی مروہ ہے، جس کو اولین قربان گاہ ہونے کی عزت حاصل ہے اور اس کے پاس ہی مسکن اسماعیل بھی ہے۔[6]''

اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ اولاد اسحاق کا قبلہ مکہ کا بیت اللہ تھا اور ان کی قربانیاں اسی کے رخ پر ہوتی تھیں۔ بعد میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب بیت المقدس کی تعمیر کی تو اس میں بھی عبادت گاہ کا رخ جنوب کی جانب تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس طرح ہماری مسجدیں قبلہ رخ تعمیر ہوتی ہیں اسی طرح بیت المقدس کی تعمیر بھی قبلہ کے رخ پر ہوئی۔ بعد کے کسی دور میں یہودیوں نے بیت المقدس کو قبلہ بنالیا اور بیت اللہ سے تعلق توڑ لیا۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کو جب بیت اللہ کی خدمت کے لیے مکہ میں بسایا گیا تو اس وقت یہ سرزمین بالکل غیر آباد، وسائل رزق سے محروم اور پرخطر تھی۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کی آبادی کی بھی دعا کی اور رزق و فضل کی کشائش اور امن وامان کی بھی۔ قرآن میں ان کی دعا یوں نقل ہوئی ہے:

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِیْ وَ بَنِیَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ. رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ وَ مَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ. رَبَّنَآ اِنِّیْۤ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ۔ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْۤ اِلَیْهِمْ وَ ارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَشْكُرُوْنَ.

(ابراہیم ۱۴: ۳۵۔ ۳۷)

''اے ہمارے رب! اس سرزمین کو پرامن بنا اور مجھ کو اور میری اولاد کو اس بات سے محفوظ رکھ کہ ہم بتوں کو پوجیں۔ اے میرے رب! ان بتوں نے لوگوں میں سے ایک خلق کثیر کو گمراہ کر رکھا ہے تو جو میری پیروی کرے وہ تو مجھ سے ہے اور جو میری نافرمانی کرے تو تو بخشنے والا مہربان ہے۔ اے ہمارے رب! میں نے اپنی اولاد میں سے ایک بن کھیتی کی وادی میں تیرے محترم گھر کے پاس بسایا ہے۔ اے ہمارے رب، تاکہ وہ نماز کا اہتمام کریں تو تو لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے اور ان کو پھلوں کی روزی عطا فرما تاکہ وہ تیرا شکر ادا کریں۔''

---

[6] ''ذبیح کون ہے''، از حمید الدین فراہی، فصل ۱۵۔

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

یہ دعا قبول ہوئی اور اس زمانہ سے آج تک مکہ مکرمہ تجارت کا ایک ایسا مرکز رہا ہے جہاں ہر شہری سہولت میسر ہے اور وہاں کے باشندے تجارت ہی سے رزق پاتے ہیں۔ خانہ کعبہ کی بدولت جو تقدس اس شہر کو حاصل ہوا اور حج اور عمرہ کی عبادات کی عظمت جو دلوں میں قائم ہوئی ، اس کی بدولت نہ صرف حرم کعبہ میں، بلکہ پورے ملک میں، مخصوص مہینوں میں امن و امان قائم رہتا جس کی بدولت حج و عمرہ کے لیے آنے والے بحفاظت اپنا سفر کر سکتے ، بلکہ ان مہینوں میں تجارت بھی ممکن ہوتی۔

جہاں تک دعائے ابراہیم کے اس حصہ کا تعلق ہے جو نسل اسماعیل میں رسول کی بعثت کے بارے میں ہے تو اس کی قبولیت کو موخر کر دیا گیا اور صدیاں گزر جانے کے باوجود اس رسول کی بعثت نہ ہوئی جس کے لیے تعمیر کعبہ کے وقت دعا کی گئی تھی۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

محمد وسیم اختر مفتی

سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.net

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارہ بیٹوں میں سے قیدار کی اولاد مکہ میں مقیم رہی۔ان کی باون ویں پشت میں زید بن کلاب کی پیدایش ہوئی۔ باپ کی وفات کے بعد مکہ سے دور شام میں سوتیلے باپ اور سوتیلے بہن بھائیوں کے ساتھ پرورش پانے کی وجہ سے وہ قصی (بعید) کے لقب سے مشہور ہوئے۔ قصی کے چار بیٹے عبدالدار، عبدمناف، عبد العزیٰ، عبد اور دو بیٹیاں تخمر اور برّہ تھیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم عبد مناف کی اولاد سے تھے جبکہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا نسب عبدالعزیٰ سے جا ملتا ہے۔ نبی کریم کا شجرۂ نسب یوں ہے: محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف بن قصی اور سیدہ خدیجہ کا اس طرح ہے، خدیجہ بنت خویلد بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی۔ قصی سے اوپر آپ دونوں کا شجرہ یکساں ہے یعنی کلاب بن مرّہ بن کعب بن لؤی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان۔ ام المومنین کا قبیلہ بنو اسد قریش کے نو ممتاز خاندانوں میں شامل تھا۔ دارالندوہ کا انتظام ان کے پاس تھا۔ قریش کے اہل حل وعقد اہم مسائل ان کے مشورے سے حل کرتے۔ رشتے میں حضرت خدیجہ کے پوتے یزید بن زمعہ اس خاندان کے آخری فرد تھے جو دارالندوہ کے انچارج ہوئے جبکہ آپ کے سگے بھتیجے حکیم بن حزام اس کے منتظم رہے۔ جب شاہ یمن تبّع نے حجر اسود کو یمن لے جانا چاہا تو خدیجہ کے والد خویلد ہی تھے جو قریش کے ایک جتھے کے ساتھ اس کے مقابل کھڑے ہو گئے۔ اس خاندان کے دوسرے نمایاں افراد میں سے ورقہ بن نوفل خدیجہ کے چچا زاد بھائی تھے اور مشہور صحابی زبیر بن عوام آپ کے بھتیجے تھے۔

سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا عام الفیل سے پندرہ برس قبل پیدا ہوئیں۔ زمانۂ جاہلیت سے آپ کا لقب طاہرہ تھا۔ آپ کا پہلا نکاح ابو ہالہ ہند بن زرارہ تمیمی سے ہوا جن سے دو بیٹے ہند اور حارث اور ایک بیٹی زینب پیدا ہوئیں۔ اس پہلے بیٹے ہند کے نام پر آپ کی کنیت ام ہند تھی۔ ابو ہالہ کی وفات کے بعد آپ کا دوسرا نکاح عتیق بن عائذ مخزومی سے ہوا جن سے ایک بیٹی ام محمد کی ولادت ہوئی۔ ہند نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہ کر پرورش پائی، مسلمان ہوئے اور بصرہ میں وفات پائی۔ خدیجہ کی عمر ۳۵ سال تھی کہ آپ کے والد خویلد بن اسد کا انتقال ہوا۔ تب حرب فجار نہ ہوئی تھی اور آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں نہ آئی تھیں۔ اس حقیقت سے ان روایتوں کا واہی ہونا یقینی ہو جاتا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی شادی کے بارے میں بیان کی جاتی ہیں کہ آپ نے اپنے والد کی مرضی کے خلاف ان کو شراب میں مدہوش کر کے تقریب نکاح منعقد کی۔

عام رؤسائے قریش کی طرح تجارت ہی حضرت خدیجہ کا ذریعۂ آمدن تھی۔ ان کا مال بڑے پیمانے پر شام جاتا تھا اور قریش کے دوسروں تاجروں کے جانے والے مجموعی مال کے برابر ہوتا۔ والد کی وفات کے بعد جب ان کے دوسرے شوہر بھی فوت ہو گئے تو انھوں نے اجرت پر تجارت شروع کی۔ کئی سال تک اپنے غلام میسرہ یا شاید اپنے چچا عمرو بن اسد کی نگرانی میں وہ کاروبار کرتی رہیں۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر پچیس برس ہو چکی تھی۔ خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ کو جانتی تھیں کیونکہ آپ کی پھوپھی صفیہ بنت عبدالمطلب، عوام بن خویلد کی بیوی اور خدیجہ رضی اللہ عنہا کی بھابھی تھیں۔ آپ اس سے پہلے بارہ سال کی عمر میں اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ شام کا سفر کر چکے تھے۔ عبداللہ بن ابوالحسا اور سائب بن عویمر مخزومی کے ساتھ کاروبار شراکت میں آپ کی دیانت وصداقت آپ کو امین کا لقب دے چکی تھی۔ انھی دنوں آپ کے چچا ابو طالب نے کہا: ''میرے پاس مال ودولت نہیں اور ہماری گزراوقات مشکل سے ہو رہی ہے۔ قریش کا یہ قافلہ شام کو جانے والا ہے۔ خدیجہ بنت خویلد اپنے تجارتی قافلوں کے ساتھ نگرانی کے لیے قریش کے آدمیوں کو بھیجتی ہیں۔ اگر تم ان کے پاس جا کر خود جانے کی پیش کش کرو تو وہ فوراً مان جائیں گی۔'' ابو طالب کے اس مشورے کی خبر خدیجہ کو پہلے ہی مل گئی، چنانچہ انھوں نے آپ کو پیغام بھیجا: ''میں آپ کو اپنی قوم کے افراد کو دینے والی اجرت سے دوگنا معاوضہ دوں گی۔'' یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ابو طالب نے خود جا کر ان سے معاوضہ بڑھانے کی بات کی۔ اس سفر میں خدیجہ کا غلام میسرہ آپ کے ساتھ تھا۔ آپ کے چچا اہل قافلہ کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دھیان رکھنے کی نصیحت کرتے رہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شام کے شہر بصریٰ پہنچ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور میسرہ، دونوں ایک درخت کے سائے تلے بیٹھے تھے۔ قریب ہی نسطورا نامی ایک راہب کا معبد تھا۔ وہ میسرہ سے ملا

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اور آپ کے نبی ہونے کی پیشین گوئی کی۔ سودا بیچتے ہوئے ایک آدمی سے آپ کی تکرار ہوگئی تو اس نے کہا: ''لات اور عزیٰ کی قسم کھاؤ۔'' آپ نے جواب میں فرمایا: ''میں نے ان کی قسم کبھی نہیں کھائی۔ میں تو ان کے پاس سے گزرتے ہوئے منہ پرے کر لیتا ہوں۔'' تب اس شخص نے آپ کی بات مان لی اور میسرہ کو کہا: ''اللہ کی قسم! یہ وہ نبی ہیں جن کا ذکر ہمارے علما نے اپنے صحیفوں میں پڑھا ہے۔'' آپ نے وہ سامان تجارت فروخت کیا اور اس کے بدلے میں اور سامان خرید لیا جسے مکہ میں بیچنے سے مزید منافع ہوا۔ سیدہ خدیجہ نے طے شدہ معاوضے سے بھی دوگنا آپ کو ادا کیا۔

میسرہ نے سفر سے واپسی پر اپنی مالکہ کو اپنے مشاہدات بتائے۔ خدیجہ نے ورقہ بن نوفل سے ان باتوں کا تذکرہ کیا تو انھوں نے کہا: ''اگر یہ باتیں سچ ہیں تو محمد اس امت کے وہ نبی ہیں جن کا انتظار کیا جا رہا ہے، یہی ان کے آنے کا زمانہ ہے۔'' اسی دوران میں مکہ میں آپ کی نیک نامی اور امانت کے خوب چرچے ہوئے۔ تین ماہ کا عرصہ نہ گزرا تھا کہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کی طرف نفیسہ بنت منیہ کو پیغام بر بنا کر بھیجا حالانکہ وہ پہلے بڑے بڑے سرداروں کی درخواست نکاح کو رد کر چکی تھیں۔ نفیسہ نے آ کر آپ سے پوچھا: ''اے محمد! آپ کے شادی کرنے میں کیا رکاوٹ ہے؟ آپ نے جواب دیا: ''میرے پاس مال نہیں جس کے ذریعے سے شادی کر سکوں۔'' اس نے کہا: ''اگر آپ کو مال سے بے نیاز کر دیا جائے اور خوب صورتی، دولت اور عزت کی دعوت دی جائے تو کیا آپ قبول کر لیں گے؟'' آپ نے پوچھا: ''یہ خاتون کون ہیں؟'' اس نے بتایا: ''خدیجہ۔'' آپ نے پوچھا: ''یہ رشتہ کیسے ہوگا؟'' اس نے کہا: ''میں کراؤں گی۔'' اس وقت خدیجہ کے چچا عمرو بن اسد زندہ تھے۔ یہ مقدس رشتہ طے ہوا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچاؤں ابوطالب، حمزہ اور خاندان کے دوسرے بزرگوں کے ساتھ سیدہ خدیجہ کے مکان پر آئے۔ آپ کے سرپرست اور چچا ابوطالب نے وہ مختصر خطبہ پڑھا جو عربی ادب کی تاریخ کا حصہ بن گیا ہے اور پانچ سو درہم مہر کے عوض یہ نکاح انجام پایا۔ یہ بعثت سے پندرہ سال پہلے ۲۵ عام الفیل کا سن تھا، آپ کی عمر مبارک ۲۵ برس اور ام المومنین خدیجہ کی ۴۰ سال تھی۔ کچھ روایتوں میں ان کی عمر ۳۵ سال بتائی گئی ہے۔ سید مرتضیٰ اور ابوجعفر طوسی کا بیان صحیح نہیں کہ حضرت خدیجہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کے وقت کنواری تھیں۔ یہ پاک رشتہ ۲۴ سال نبھا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ کی زندگی میں دوسری شادی نہ کی اور حضرت ابراہیم کے علاوہ آپ کی تمام اولاد انھی کے بطن سے پیدا ہوئی۔ اگرچہ تاریخ میں ان کے حلیے کی تفصیل نہیں ملتی، لیکن پیام نکاح لے جانے والی نفیسہ بنت منیہ کے الفاظ ''اگر آپ کو مال، جمال اور اخراجات کی کفالت کی دعوت دی جائے تو آپ منظور کریں گے؟'' ظاہر کرتے ہیں کہ آپ خوب صورت تھیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتدا رویاے صالحہ سے ہوئی، جو خواب آپ دیکھتے سپیدۂ سحر کی طرح نمودار ہو جاتا۔ پھر آپ خلوت گزیں ہو گئے، خورونوش کا سامان لے جا کر کئی کئی راتیں تنہا غار حرا میں گزارتے۔ آپ اسی غار میں تھے کہ جبریل علیہ السلام کی آمد ہوئی۔ حکم ہوا، 'اقرأ'، پڑھ۔ جواب فرمایا: میں پڑھا ہوا نہیں۔ جبریل نے پکڑا، پکڑ کر دبایا اور کہا، 'اقرأ'، پڑھ۔ آپ نے جواب ارشاد کیا، میں پڑھا ہوا نہیں۔ تیسری بار بھی یہ سوال جواب ہوا اور پھر وحی مکمل ہوئی: 'اقرأ باسم ربك الذی خلق. خلق الانسان من علق . اقرأ و ربك الاکرم. الذی علّم بالقلم. علّم الانسان ما لم یعلم'۔ ''پڑھ اپنے پروردگار کا نام لے کر جس نے پیدا کیا۔ پیدا کیا انسان کو خون کے جمے لوتھڑے سے۔ پڑھ، اور تیرا رب بہت باعزت (اور کرم فرما) ہے۔ جس نے سکھایا قلم کے ذریعے سے۔ سکھایا انسان کو جو وہ نہ جانتا تھا۔'' (سورۂ علق ۱۔۵) اس وحی سے آپ اس قدر خوف زدہ ہوئے کہ کانپنے لگے۔ گھر پہنچ کر کمبل اڑھانے کو کہا۔ تب حضرت خدیجہ ہی تھیں جنھوں نے آپ کی ڈھارس بندھائی انھوں نے کہا: ''نہیں! واللہ، خدا آپ کو ہرگز رسوا نہیں کرے گا۔ آپ صلۂ رحمی کرتے ہیں، بے کسوں اور فقیروں کی مدد کرتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں اور مشکلات میں حق کی حمایت کرتے ہیں۔'' پھر وہ آپ کو اپنے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو نصرانی ہو چکے تھے، عام عربوں کے برعکس لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور عربی میں انجیل تحریر کرتے تھے۔ اس وقت وہ ضعیف اور نابینا ہو گئے تھے، انھوں نے غار حرا میں وحی لانے والے فرشتے کی تفصیل سن کر کہا: ''یہ وہ ناموس ہے جو اللہ نے موسیٰ علیہ السلام پر اتارا تھا۔ کاش اس وقت مجھ میں قوت ہوتی اور میں زندہ رہتا جب آپ کی قوم آپ کو شہر بدر کرے گی۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ''کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟'' ورقہ کا جواب تھا: ''دنیا میں جب بھی کوئی پیام وحی لایا تو دنیا اس کی دشمن ہوگئی۔ اگر تب میں زندہ ہوا تو آپ کی بھرپور مدد کروں گا۔'' تھوڑے دنوں کے بعد ورقہ کو اجل نے آن لیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس روایت کی روشنی میں حضرت خدیجہ کے قبول اسلام کا زمانہ متعین کیا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ وہ مردوں اور عورتوں میں سب سے پہلے اسلام لائیں۔ کچھ حضرات کہتے ہیں کہ علی سب سے پہلے ایمان لائے، لیکن وہ اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھے، ان کے برعکس واقدی کا کہنا ہے کہ وہ اعلان نبوت کے ایک سال بعد مسلمان ہوئے۔ یہ روایت بھی مشہور ہے کہ ابوبکر پہلے مسلمان تھے۔ اس مسئلے کو اس طرح حل کیا جا سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حرا سے اتر کر سب سے پہلے گھر تشریف لائے اور اپنی اہلیہ خدیجہ ہی سے کہا: 'زمّلونی، زمّلونی' (مجھے کمبل اڑھاؤ، مجھے کمبل اڑھاؤ)۔ وہ آپ سے نکاح سے پہلے ہی اپنے چچا زاد ورقہ سے آپ میں نبوت کی نشانیوں کا پایا جانا معلوم کر چکی

تھیں، اس کے علاوہ آپ کے ساتھ پندرہ سالہ خانگی زندگی گزار کر آپ کی راست بازی اور دیانت کا تجربہ کر چکی تھیں۔ اس لیے اسی لمحے انھوں نے ایمان قبول کر لیا ہوگا، ان کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج شناس اور قریبی دوست ابوبکر کا نمبر رہا ہوگا اور اس وقت آپ کے زیر کفالت علی کو حقیقت ایمان کو سمجھنے میں چند روز تو لگے ہوں گے۔ یحییٰ بن عفیف کہتے ہیں: ''میں زمانۂ جاہلیت میں مکہ آ کر عباس بن عبدالمطلب کا مہمان ہوا۔ دن چڑھتے ہی ایک نوجوان نے کعبے کا رخ کیا، کچھ ہی دیر بعد ایک لڑکا آ کر اس کے دائیں طرف اور ایک خاتون پیچھے کھڑی ہو گئی۔ وہ مل کر رکوع وسجود کرنے لگے۔ مجھے عباس نے بتایا: یہ میرے بھتیجے محمد بن عبداللہ، علی بن ابوطالب اور خدیجہ بنت خویلد ہیں۔ یہ تینوں ایک دین کے پیروکار ہیں۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کے وقت سیدہ خدیجہ کی عمر پچپن سال تھی۔ ان کے اسلام قبول کرنے سے اشاعت اسلام پر خوش گوار اثر پڑا۔ بنو اسد میں ان کے دس عزیزوں نے اسلام قبول کیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آنے کے بعد خدیجہ کبریٰ رضی اللہ عنہا کی اس ترتیب سے چھ اولادیں ہوئیں۔ قاسم، زینب، رقیہ، ام کلثوم، فاطمہ اور عبداللہ۔ عبداللہ کے علاوہ سب بچے آپ کے منصب نبوت پر سرفراز ہونے سے پہلے پیدا ہوئے۔ پہلے بیٹے قاسم کے نام پر آپ کی کنیت ابوالقاسم تھی۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

نعمت ایمان سے سرفراز ہونے کے بعد ام المومنین خدیجہ رضی اللہ عنہا کی سب دولت وثروت تبلیغ اسلام کے لیے وقف ہو گئی۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کاروبار ترک کر کے دینی امور میں مصروف تھے۔ آمدن بند ہو جانے کے بعد جمع پونجی پر گزر بسر ہو رہی تھی۔ بڑے صاحب زادے قاسم دو سال کے ہو کر ابھی چلنا شروع ہوئے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ بڑی بیٹی زینب کی شادی حضرت خدیجہ کے بھانجے ابوالعاص سے ہو چکی تھی۔ دوسری اور تیسری دختران رسالت رقیہ اور ام کلثوم کا نکاح آپ کے چچا ابولہب کے بیٹوں سے ہوا تھا جو چچا کی اسلام دشمنی کی وجہ سے فسخ کر دیا گیا تھا۔ ان میں سے بڑی رقیہ کا نکاح آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے فرما دیا اور بعثت کے دو برس بعد رخصتی ہو گئی۔ ام کلثوم اور فاطمہ ابھی چھوٹی تھیں۔ نبوت کے ایک سال بعد عبداللہ کی ولادت ہوئی۔ ابو ہالہ سے حضرت خدیجہ کے پہلے دو بچے ہالہ اور ہند بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش میں تھے، اس لیے ربیب رسول کہلاتے تھے۔ جوں جوں کفار کی مخالفت بڑھتی گئی، حضرت خدیجہ کی پریشانیوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ خود بھی صبر سے کام لیتیں اور آپ کو بھی تسلی دیتیں۔ عبداللہ کی پیدایش سے بڑے بیٹے قاسم کی مرگ کا صدمہ کم ہو گیا تھا، لیکن طاہر وطیب کا لقب پانے والے عبداللہ قاسم سے بھی کم عمر میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ۵ نبوی میں ہجرت حبشہ پیش آئی۔ اس وقت رقیہ کی عمر بارہ برس تھی۔ وہ

اپنے شوہر عثمان غنی کے ساتھ حبشہ کو ہجرت کر گئیں۔ ان کی واپسی ۴ سال کے بعد ۹ نبوی میں ہوئی۔ اتنا عرصہ بیٹی سے جدائی بھی ماں کے لیے تکلیف دہ عمل تھا۔ ۸ نبوی میں حبشہ ہی میں خانوادۂ رسالت کے پہلے نواسے عبداللہ بن عثمان کی ولادت ہوئی۔

محرم ۷ نبوی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شعب ابی طالب میں محصور ہونا پڑا۔ حبشہ کے شاہ نجاشی نے مہاجر صحابہ کو پناہ دی۔ دو نامی صحابہ عمر بن خطاب اور حمزہ بن عبدالمطلب کے مشرف بہ اسلام ہونے سے اسلام کو طاقت ملی تو قریش نے باہم مشورے سے بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب کا مقاطعہ کر دیا۔ کعبے کے متولی خاندان بنو عبدالدار کے منصور بن عکرمہ نے ایک معاہدہ تحریر کر کے کعبے کے اندر لٹکا دیا۔ اس کی رو سے کوئی شخص بنو ہاشم سے بات چیت کر سکتا تھا نہ ان سے میل جول رکھ سکتا تھا۔ کھانے پینے کا سامان ان کو پہنچا سکتا تھا نہ ان سے رشتہ داری وقرابت کر سکتا تھا جب تک وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کے لیے قریش کے حوالے نہ کر دیتے۔ ان دونوں خاندانوں کے پچاس کے قریب افراد نے جبل ابوقبیس کے ایک درے کی گھاٹی میں پناہ لی جو شعب ابی طالب کے نام سے مشہور ہے۔ یہ بنو ہاشم کا موروثی درہ تھا۔ ابوطالب اور سیدہ خدیجہ آپ کے ساتھ تھے جبکہ ابولہب بنو عبدالمطلب میں سے ہونے کے باوجود الگ رہا۔ تین سال آپ اور آپ کے اہل خانہ یہاں مقیم رہے۔ کھانے پینے کی چیزیں بہت مشکل سے چھپ چھپا کر پہنچتی تھیں۔ حضرت خدیجہ کے تین بھتیجے حکیم بن حزام، ابوالبختری بن ہشام اور زمعہ بن اسود کافر ہونے کے باوجود غلہ پہنچاتے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب کے سوتیلے بھائی نضلہ کا رشتے کا پوتا ہشام بن عمرو قرابت داری کا پاس کرتے ہوئے اونٹ پر کھانے کا سامان لاد کر لاتا اور درے کے قریب چھوڑ جاتا۔ مسلسل تین سال تک آپ نے اور تمام اہل ہاشم نے یہ مصیبتیں جھیلیں۔ اس دوران میں منصور عبدری کا وہ ہاتھ ہی مفلوج ہو چکا تھا جس سے اس نے معاہدہ تحریر کیا تھا۔ معاہدے کی دستاویز کو دیمک کھا چکی تھی اور اس پر اللہ کے نام کے سوا کچھ نہ بچا تھا۔ قریش میں بھی ایسے افراد تھے جو اس بائیکاٹ کو پسند نہ کرتے تھے۔ چنانچہ پانچ معزز قریشی اس معاہدے کو توڑنے کے لیے آگے بڑھے۔ ہشام بن عمرو عامری، زہیر بن ابوامیہ مخزومی، مطعم بن عدی، ابوالبختری بن ہشام اور زمعہ بن اسود ان کے نام تھے اور ان میں سے آخری دو خدیجہ کے بھتیجے تھے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

شعب ابی طالب سے نکلے کچھ روز ہوئے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریک حیات اور دکھ سکھ میں ان کا ساتھ دینے والی سیدہ خدیجہ کی وفات ہو گئی۔ ان کی عمر ۶۵ سال تھی۔ یہ ہجرت سے ۳ برس پہلے کا واقعہ ہے۔ تاریخ ۱۰ رمضان ۱۰ نبوی تھی۔ حجون کے قبرستان میں عبدالمطلب کی قبر سے کچھ دوران کی تدفین کی گئی، ام ایمن اور

ام فضل نے ان کو غسل دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود قبر میں اترے، اب اس قبرستان کو جنت المعلا کہا جاتا ہے۔ تین دن قبل آپ کے چچا ابو طالب انتقال کر چکے تھے، ان دونوں صدموں کی بنا پر ۱۰ نبوی کے سن کو عام الحزن (غم کا سال) کہا جاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سیدہ خدیجہ کی خدمات کا اعتراف کر کے فرمایا کرتے تھے: ''خدیجہ اس وقت مجھ پر ایمان لائیں جب لوگوں نے میرا انکار کیا اور انھوں نے اس وقت میری تصدیق کی جب اور لوگوں نے مجھے جھوٹا قرار دیا۔ انھوں نے اپنے مال سے اس وقت میری مدد کی جب دوسروں نے مجھے اس سے محروم کر دیا۔ اللہ نے مجھے ان سے اولاد دی جب کہ دوسری ازواج سے یہ نعمت نہ ملی۔'' آپ نے انھیں جنت کی بشارت بھی دی۔ آپ زندگی بھر ان کو یاد کرتے رہے حتیٰ کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''آپ اکثر ان کا ذکر فرماتے تھے۔ کوئی بکری بھی ذبح کرتے تو خدیجہ کی سہیلیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر انھیں اس میں سے حصہ بھیجتے۔'' جبریل علیہ السلام بھی خدیجہ کے لیے سلام لے کر آتے۔ اللہ ان پر رحمتیں فرمائے۔

مطالعۂ مزید: الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبدالبر)، السیرۃ النبویہ (ابن کثیر)، رحمت للعالمین (قاضی سلیمان منصور پوری)، اردو دائرہ معارف اسلامیہ (پنجاب یونیورسٹی)۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اخذ وتحریر: محمد یاسر عرفات
نظر ثانی: منظور الحسن

''مسلم ریاست جدید کیسے بنے؟''

[جناب محمود مرزا کی کتاب ''مسلم ریاست جدید کیسے بنے؟''
کی تقریب رونمائی میں جناب جاوید احمد غامدی کا خطاب]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

محمود مرزا صاحب کی کتاب ''مسلم ریاست جدید کیسے بنے؟'' اپنے موضوع، مدعا اور ترتیب مقالات کے لحاظ سے غیر معمولی توجہ کی مستحق ہے۔ ہم جب اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہیں تو اس کی ترتیب و تالیف کو بھی دیکھ سکتے ہیں اور اس کی زبان و بیان کا جائزہ بھی لے سکتے ہیں، لیکن یہ مستحق ہے کہ ان چیزوں سے قطع نظر کر کے یہ دیکھا جائے کہ اس میں مصنف نے اپنے کیا نتائج فکر پیش کیے ہیں اور ان نتائج فکر کو پیش کرنے کے لیے اپنے کس ذہنی پس منظر کو ہمارے سامنے کھول کر رکھا ہے۔ اس کتاب میں ایسے موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے کہ جن پر کئی پہلووں سے گفتگو ہو سکتی ہے۔ مرزا صاحب کے لکھنے کا اسلوب بھی ایسا ہے کہ وہ جب ایک موضوع پر گفتگو کرتے ہیں تو بعض اوقات اس کی کئی سمتوں کی طرف اشارے کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان سے کوئی صاحب فکر اختلاف بھی کر سکتا ہے اور اتفاق بھی کر سکتا ہے۔ اس موقع پر میں اس کتاب میں بیان کیے گئے مرزا صاحب کے چند نتائج فکر کو اپنا موضوع بناؤں گا اور ان چیزوں سے قطع نظر کر لوں گا جن میں انھوں نے وقت کے احوال کا تجزیہ کیا ہے، کسی تاریخی معاملے پر کوئی تبصرہ کیا ہے یا مسلم معاشرے کے بعض عوامل کو نمایاں کیا ہے۔ ان میں سے بہت سی چیزیں ہیں جن سے ہو سکتا ہے کہ ہم میں سے کوئی شخص اختلاف کرے یا انھیں کسی دوسرے زاویۂ نظر سے دیکھے۔

کتاب کا اہم ترین حصہ بعض وہ نتائج فکر ہیں جو اس کے عنوان کے لحاظ سے بیان ہوئے ہیں۔ان میں سے پہلی چیز جس کی طرف میں آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہوں گا، وہ یہ ہے کہ کتاب میں جگہ جگہ انھوں نے اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہم نے جب پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانا چاہا تو ہمارے پاس اسلام کی طرف سے بظاہر چند اقدار تو تھیں اور کچھ اصول بھی تھے، لیکن کیا فی الواقع اس کے لیے ہم ایک باقاعدہ نظام رکھتے تھے جو بالخصوص سیاست، معیشت اور معاشرت کے حوالے سے ہو اور جسے ہم جیب سے نکالیں اور ملک میں نافذ کر دیں۔ یہ سوال اس وجہ سے پیدا ہوا کہ موجودہ زمانے میں، بالخصوص پچھلی صدی میں بعض ایسے مفکرین پیدا ہوئے جنھوں نے اسلام کی علمی تاریخ میں پہلی مرتبہ اسلامی نظام کی اصطلاح بھی استعمال کی اور یہ دعویٰ بھی کیا کہ اسلام سیاست، معیشت اور معاشرت کے بارے میں ایک منظّم نظام لے کر آیا ہے اور اس نظام کے غلبے کا داعی ہے۔ مرزا صاحب نے اس معاملے میں جو سوالات اٹھائے ہیں، آپ ان کی کتاب پڑھیے، وہ اس سے واضح ہو جائیں گے۔ میں ان کے اس بنیادی نکتے کی تائید کرتا ہوں۔ اسلام کے پورے مشمولات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ سیاست، معیشت اور معاشرت کے معاملے میں اس نے ہرگز کوئی نظام نہیں دیا۔ یہ بات آپ کے سامنے ایک ایسا شخص کہہ رہا ہے جس نے اپنی زندگی کے پچیس تیس سال اسی مطالعے میں صرف کیے ہیں۔ اسلام کی نوعیت اس معاملے میں یہ نہیں ہے کہ اس نے آپ کے سامنے ایک پورا سسٹم بنا کر رکھ دیا ہو اور پھر لوگوں کا کام اس کے سوا کچھ نہ ہو کہ وہ اس کو اٹھائیں اور کسی معاشرے پر لاگو کر دیں۔ اسلام کے مشمولات میں دو چیزیں آپ کو ملیں گی۔ ایک وہ اخلاقی اقدار ملیں گی جن کو وہ انسان میں اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لحاظ سے پیدا کرنا چاہتا ہے اور دوسرا قانون ملے گا جس کا میں آگے چل کر ذکر کروں گا۔ نظام نام کی کوئی چیز آپ کو اس میں میسر نہیں آئے گی۔ نظام کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی جسے آپ خاص طور پر بنا کر لوگوں کو دے دیں اور وہ ہر دور کے لیے قابل عمل رہے۔ نظام ترقی اور تمدن کے عوامل کے ساتھ ساتھ آگے چلتا ہے۔ دنیا پتھر کے زمانے سے نکلی، زرعی زمینوں کے ذریعے سے معیشت پر استوار ہوئی، مختلف مراحل سے گزرتی ہوئی صنعتی دور میں داخل ہو گئی اور اب ایک قدم آگے بڑھا کر اس دور میں داخل ہو رہی ہے جہاں شاید صنعتی دور کے زمانے کی بھی بہت سی چیزیں فرسودہ ہو چکی ہیں۔ جب صورت حال یہ ہو تو پھر یہ کسی طرح موزوں نہیں ہو سکتا تھا کہ کوئی چیز آپ کو جزئیات کے ساتھ بنا کر دے دی جاتی اور آپ اسے معاشرے میں نافذ کر دیتے۔ ہمارے ہاں نظام کا جو طرز فکر پیدا ہوا، اس سے سب سے بڑا نقصان یہ پہنچا کہ جو کام ہم مسلمانوں کے کرنے کا تھا، وہ ہم نے خدا کے سپرد کر دیا اور اس طریقے سے اس سارے عمل ہی سے فارغ ہو کر

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

بیٹھ گئے جس کو کیے بغیر یا تخلیقی فعالیت کا مظاہرہ کیے بغیر ہم دنیا میں کھڑے نہیں ہو سکتے۔

لوگ بہت اطمینان کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ ہم خلافت کا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے ایک مذہبی دانش ور سے پوچھا کہ اس سے آپ کی کیا مراد ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ اس سے ہماری مراد خلافت راشدہ کا نظام ہے۔ میں نے ادب سے عرض کیا کہ ذرا وہ بتا دیجیے کہ کیا تھا؟ تو انھوں نے کہا کہ اس میں Accountability تھی۔ میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ وہ کون سا نظام ہے جس میں اس اصول کو نہیں مانا جاتا کہ لوگوں کو جواب دہ ہونا چاہیے؟ ہم اصل میں اس فرق سے واقف نہیں ہیں کہ نظام کیا ہوتا ہے، اخلاقی اقدار کیا ہوتی ہیں، اور چیزوں کے بارے میں قانونی حد بندی کیسے ہوا کرتی ہے؟

موجودہ زمانے میں انسان نے ایک بڑا طویل سفر طے کیا ہے اور میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ یہ سفر صرف سائنس ہی کے میدان میں نہیں ہوا، سماجی علوم میں بھی انسان نے بڑا طویل سفر طے کر لیا ہے۔ مرزا صاحب نے اپنی کتاب میں جگہ جگہ اس جانب توجہ دلائی ہے کہ یہ سفر بھی اتنا ہی قابل لحاظ ہے جتنا سائنسی انکشافات کا سفر قابل لحاظ ہے۔ یعنی انسان کے نظام بنانے کا عمل اب اس منتہا تک پہنچ گیا ہے کہ اس وقت ہم اپنی سیاست کے لیے، اپنی معیشت کے لیے اور اپنی معاشرت کے لیے طوعاً کرہاً اس نظام کو اپنائے ہوئے ہیں، اور مذہبی راہنماؤں کی اگر آپ گفتگو سنیں تو معلوم ہوگا کہ کبھی وہ یہ فرمائیں گے کہ پارلیمانی طریقے میں یہ تھوڑی سی تبدیلی کر لیجیے اور ذرا صدارتی نظام میں یہ تھوڑی سی تبدیلی کر لیجیے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان نے اپنے تمدنی سفر میں نظام بنانے کے عمل کو بھی نہایت درجہ پیچیدہ اور محکم کر لیا ہے۔ چنانچہ ہم جس طرح سے سائنسی ترقیوں کے نتائج سے صرف نظر نہیں کر سکتے اسی طرح سماجی علوم کے معاملے میں جو ترقی ہوئی ہے، اس سے بھی صرف نظر نہیں کر سکتے۔ لہٰذا یہ ناگزیر ہے کہ ہمارے اندر ایسے لوگ پیدا ہوں جو اپنے اندر غیر معمولی تخلیقی صلاحیت رکھتے ہوں۔ ان اقدار کا ادراک رکھتے ہوں جو اسلام نے دی ہیں اور قانونی حدود کی نوعیت سے بھی آگاہ ہوں جو اسلام نے متعین کی ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ دیکھ سکیں کہ دنیا نے تہذیب و تمدن اور سماجی علوم کے معاملے میں اب تک کیا سفر طے کیا ہے۔ وہ دنیا کے اس سفر پر مجتہدانہ نگاہ ڈالتے ہوئے اس کو آگے بڑھا سکیں۔ ورنہ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ اپنی طرف سے چند الفاظ بولتے رہیں اور دنیا کی قطعی حقیقتیں آپ سے نظر چرا کر کسی اور جانب چلی جائیں۔ آپ کو ان کا سامنا کرنا پڑے گا اور ان نتائج کو قبول کرنا پڑے گا۔

میرے نزدیک پہلی بات جو اس کتاب کے حوالے سے سامنے رہنی چاہیے، وہ یہ ہے کہ اب ہم اس تابوت سے

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

نجات حاصل کر لیں اور اپنے آپ کو اس چیز کے لیے آمادہ کریں کہ اس دنیا میں ہم کو جینا ہے، اللہ تعالیٰ نے جو ہدایت اور رہنمائی ہم کو دے دی ہے، وہ ہماری قیمتی متاع ہے، لیکن وہ رہنمائی اقدار کی نوعیت کی ہے یا چند قوانین کی تحدید کی نوعیت کی ہے، اس کو معاشرے کے ساتھ متعلق کر کے نظام میں بدلنے کا کام ہم کو انجام دینا ہے۔ اگر ہم اپنا کام نہیں کریں گے تو خدا کی یہ سنت نہیں ہے کہ وہ آسمان سے اتر کر انسانوں کے کام کیا کرے۔

دوسری چیز جس کی طرف میں آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں اور مرزا صاحب نے بھی جگہ جگہ اپنی کتاب میں توجہ دلائی ہے، وہ یہ ہے کہ شریعت کی تعمیر نو کی جائے۔ اس معاملے میں ہمارے ہاں علامہ اقبال سے لے کر اب تک کوئی تین چار مکاتب فکر پیدا ہو چکے ہیں۔ ایک مکتب فکر تو ہمارے قدیم علما کا ہے جو شریعت کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے ان کی مراد یا تو فقہ حنفی ہوتی ہے یا فقہ شافعی ہوتی ہے یا فقہ مالکی ہوتی ہے یا فقہ حنبلی ہوتی ہے یا ائمۂ اربعہ کی فقہ ہوتی ہے یا یہ کہ بہت سے دوسرے لوگوں کی تحقیقات کو شامل کر کے فقہ اسلامی ہوتی ہے۔ لیکن کیا یہ ساری کی ساری فقہ شریعت ہے؟ وہ کم از کم یہی سمجھتے ہیں۔

دوسرا نقطۂ نظر وہ ہے جس کی دور جدید میں موثر نمائندگی ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب نے کی ہے اور مرزا صاحب نے ان کے بعض اقتباسات بھی اپنی کتاب میں نقل کیے ہیں کہ شریعت کے جو احکام بھی قرآن مجید میں یا روایات میں ملتے ہیں، یہ درحقیقت اس دور کے تقاضوں کے لحاظ سے دیے گئے تھے۔ ان احکام میں اصل چیز ان کا ڈھانچا نہیں، بلکہ ان کا مقصد ہے اور اس مقصد کو سامنے رکھ کر ہمیں اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق قانون سازی کرنی ہے۔

تیسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ شریعت کے احکام تو ہیں، لیکن وہ اجتہادی بصیرت کے ساتھ نفاذ کا تقاضا کرتے ہیں اور ان میں کوئی ردوبدل کرنا پڑے تو مجتہدانہ طریقے سے مسلمان اور ان کے نمائندے کر سکتے ہیں۔

اور ایک نقطۂ نظر وہ ہے کہ جس کی نمائندگی بڑی حد تک یہ فقیر کرتا ہے کہ صورت حال ذرا اس سے زیادہ تفصیل کی طالب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو شریعت دی ہے، شریعت کے معنی قانون کے ہیں۔ یعنی صورت حال یہ نہیں ہے کہ سارے کا سارا دین صرف ایمان و اخلاق پر مبنی ہے، بلکہ اس کے ساتھ کچھ قوانین بھی دیے گئے ہیں۔ ان قوانین کو دینے کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے، وہ ان قوانین کا مطالعہ کرنے سے بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ یعنی انسان کے ساتھ معاملہ یہ ہے کہ اللہ نے اسے عقل دے رکھی ہے۔ اس کی روشنی میں وہ اپنا سفر طے کرتا ہے۔ اپنے انفرادی اور اجتماعی مسائل حل کرتا ہے اور پھر جو چیزیں پیش آتی ہیں، ان میں نئی نئی طرحیں

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

بھی نکالتا ہے۔ یہ سارا کام بڑے وسیع پیمانے پر انسان کرتا ہے جیسے کہ اس وقت بھی وہ کر رہا ہے، لیکن کچھ معاملات ایسے ہیں جن میں بنیادی طور پر اس کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے اور اگر وہ فیصلہ نہ کیا جائے تو اس کے اثرات دنیا اور آخرت، دونوں کے اعتبار سے دوررس ہو سکتے ہیں۔ وہ چند معاملات ہیں۔ یہی معاملات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ابدی شریعت کے احکامات دیے ہیں۔ ان احکام کے معاملے میں جو اصل غلطی ہو رہی ہے، وہ ان کی تعبیر کا معاملہ ہے۔ ہم چونکہ کم و بیش بارہ صدیوں سے یہ بات طے کر کے بیٹھ گئے ہیں کہ ہمارے ہاں جو کچھ پہلی، دوسری اور تیسری صدی کے فقہا نے ترتیب دے دیا ہے، اس میں کوئی تغیر نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا تعبیر کا معاملہ بھی ایسا ہو کر رہ گیا ہے کہ جیسے آپ کسی مکان کے اوپر تالا ڈال کر برسوں کے لیے چلے جائیں اور پھر جب اپنے ہی گھر کا تالا کھولنا چاہیں تو ہم سائے جاگ اٹھیں۔ اگر آپ روز دروازہ کھولتے رہتے ہیں تو کسی کو تردد نہیں ہوتا۔ سو تعبیر کا معاملہ بھی یہی ہو گیا ہے۔ ایک لمبے عرصے سے چونکہ لوگ اس سے آشنا نہیں رہے، لہٰذا جو کہہ دیا گیا ہے، وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہی الہام ہے، یہی وحی ہے کہ جو براہ راست جبریل امین بول رہے ہیں۔ چنانچہ ضرورت یہ ہے کہ ایسے جرات مند لوگ پیدا ہوں جو قدیم علوم کے اوپر بھی مجتہدانہ نظر رکھتے ہوں، جدید علوم کو بھی بہت اچھی طرح سمجھتے ہوں اور جو کچھ بھی شریعت کی تعبیر کی گئی ہے، اس پر ایک نگاہ ڈال کر یہ دیکھیں کہ اس میں کیا چیز صحیح ہے اور کس چیز میں انسانی سوء فہم کو دخل حاصل ہو گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کام جس جرات، جس علم، جس ذہانت اور جس تدبر کا تقاضا کرتا ہے، وہ تفصیل کا محتاج نہیں ہے، لیکن بہر حال ہمیں یہ کرنا ہے اور اس کو کیے بغیر ہمارے لیے کوئی راستہ نہیں ہو سکتا ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ اس شریعت کو فقہ کے انبار سے بالکل الگ کر دینا چاہیے۔ فقہ انسانی کام ہے۔ یہ وہی کام ہے جس کے بارے میں میں نے پہلے نکتے کے ذیل میں اشارہ کیا ہے کہ نظام ہم کو بنانا ہے۔ اپنے اپنے دور کے لحاظ سے جو قانونی تقاضے پیدا ہوئے، اس میں ہمارے فقہا نے اجتہاد کیا۔ ان میں سے کچھ اجتہادات ایسے ہو سکتے ہیں کہ جو ان کے اپنے دور کے لحاظ سے بہت موزوں ہوں۔ زمانے کے عرف کے لحاظ سے بہت موزوں ہوں، لیکن اب وہ کسی لحاظ سے بھی قابل عمل نہیں رہے، کیونکہ بہت سے معاملات ایسے ہوتے ہیں کہ جو غلط ہوتے ہیں، لیکن ایک زمانے میں چل جاتے ہیں اور دوسرے زمانے میں وہ غلط بھی ہوتے ہیں اور چلتے بھی نہیں۔ ان تمام اجتہادات سے جو ہماری فقہ ترتیب پائی ہے، وہ انسانی کام ہے اور اس کو ہم کو بہر حال الگ کر کے، شریعت کے جو احکام ہیں، ان کو متعین کرنا ہو گا تا کہ ہم یہ اندازہ کر سکیں کہ کیا بات ہے جو خدا کی بات ہے اور کیا بات ہے جو انسانوں کی بات

ہے۔اس وقت جو اسلام سامنے آتا ہے، وہ نوے فی صد خدا کی بات نہیں، انسانوں کی بات ہوتی ہے اور اسی کے لحاظ سے نہ وہ علم کی گرفت میں آتی ہے، نہ عقل کی گرفت میں آتی ہے اور نہ اس کی بنیاد پر اجتماعی اور انفرادی زندگی کو استوار کرنا ممکن معلوم ہوتا ہے۔

تیسری چیز یہ ہے کہ ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ شریعت کے احکام کی پھر دو نوعیتیں ہیں۔ایک وہ احکام ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کی ازواج مطہرات کو اس وقت کی صورت حال میں، بعض تدابیر کی حیثیت سے دیے گئے۔اس وقت چونکہ وقت بہت ہو رہا ہے ورنہ میں آپ کو اس کی مثالیں دے کر بتاتا کہ ان کی نوعیت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے کتنے سنگین مسائل مسلمانوں کی فقہ میں پیدا ہوئے اور کیسے کیسے نکات اس کے نتیجے میں ایسے متفق علیہ نکات بن گئے ہیں کہ اب ان کے اوپر تنقید کی جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا ہے۔لیکن بہر حال یہ جرات تو لوگوں کو کرنا پڑے گی اور یہ بتانا پڑے گا کہ یہ وہ چیزیں ہیں جو وقتی تدابیر کی نوعیت کی تھیں، یہ ایک زمانے کے حالات کے لحاظ سے کہی گئیں اور دی گئیں یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے ساتھ خاص تھیں۔ان کا ہمارے ساتھ اب وہ تعلق نہیں ہے۔ یہ ہماری تاریخ کا حصہ ہیں اور ان کی اپنی افادیت ہے، لیکن بہر حال یہ اب سوسائٹی میں نافذ نہیں ہوں گی اور نہ قرآن کا یہ منشا ہے کہ نافذ ہوں۔

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

اب یقیناً آپ یہ فرمائیں گے کہ اس کا فیصلہ کون کرے گا؟ میں آپ کو پورے اطمینان کے ساتھ اپنے ربع صدی کے علمی تجربے کی روشنی میں یہ بتاتا ہوں کہ اس کا فیصلہ نہایت وضاحت کے ساتھ خود قرآن کرتا ہے، اور وہ بتا دیتا ہے کہ کیا چیز اس کا ابدی حکم ہے اور کیا چیز ایسی ہے کہ جس میں وقتی نوعیت کی تدبیر کی گئی یا وقتی نوعیت کا حکم دیا گیا جو اپنے زمانے کے لحاظ سے روبۂ عمل ہوا اور پھر ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔اس میں اگلی چیز جو ملحوظ رکھنے کی ہے، وہ یہ ہے کہ ہم جب ان احکام و قوانین کا مطالعہ کریں گے تو اس چیز کا بھی لحاظ رکھنا ناگزیر ہو گا کہ جو باتیں ہم اب بیان کر رہے ہیں، اگر وہ اجمال کے ساتھ بیان کی گئی ہیں تو کیا ان کی تفصیلات کے وہ ڈھانچے بھی قبول کرنے ہوں گے جو بعد کے لوگوں نے بنا دیے ہیں۔اس معاملے میں بھی ایک جرات مندانہ اقدام کی ضرورت ہو گی کہ ہم اس اجمال کو خود اپنی بصیرت کی روشنی میں کھولیں اور اپنے تمدن کے تقاضوں کے لحاظ سے ان کو متعین کریں۔ یہ جو ہم بہت سی چیزیں دیکھتے ہیں، حدود آرڈیننس اور دیگر اس نوعیت کی، ان میں اگر دیکھیے تو اسلام شاید دو سطروں کا ہو گا، باقی سارا یہی کام ہے جو انسانوں نے آج کے زمانے میں بھی کر ڈالا ہے۔اس کو بھی الگ کر کے دیکھنے کی اور الگ کر کے متعین کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ یہ اسلام نہیں ہے، یہ خدا کے دین کا یا خدا کا حکم نہیں ہے، یہ ہمارا کام

ہے اور ہم بہر حال خطا کار انسان ہیں۔ ہم غلطی کر سکتے ہیں اور ہمیں اپنی غلطی کا اعتراف کرنے میں اور اس کو واپس لینے میں کوئی باک نہیں ہونا چاہیے۔

شریعت کے معاملے میں ایک اور پہلو بھی قابل توجہ ہے اور اس کو ہمیشہ ملحوظ رہنا چاہیے۔ اس نازک فرق کو بالعموم موجودہ زمانے کے علما نے تشریح کرتے ہوئے ملحوظ نہیں رکھا، جبکہ قدیم علما نے یہ غلطی نہیں کی۔ وہ فرق یہ ہے کہ کس چیز سے اللہ نے یا اللہ کے پیغمبر نے روک دیا ہے اور کس چیز کے بارے میں ایک دائرے میں قانون سازی کر دی ہے اور باقی کو چھوڑ دیا ہے۔ مثال کے طور پر میں ایک سادہ سی بات آپ سے کہتا ہوں کہ اگر تو صورت حال یہ تھی کہ اسلام میں حکم دیا گیا ہوتا کہ آپ کو چار شادیاں کرنا ہیں تو نوعیت بہت مختلف ہو جاتی۔ اگر مثال کے طور پر آپ کو یہ حکم دیا گیا ہوتا کہ آپ کو چار شادیوں کی اجازت ہر حال میں قائم رکھنی ہے تو تب بھی نوعیت بہت مختلف ہو جاتی۔ اسلام نے ایک سے زیادہ شادیوں پر کچھ پابندیاں لگا کر باقی معاملے کو انسانی معاشرے اور تمدن کی ترقی اور ارتقا پر چھوڑ دیا ہے۔ یہ ایک بڑا دائرہ ہے جس کے اندر ہم کو قانون سازی کا اختیار تھا۔ قدیم فقہا اس کو اس طرح بیان کرتے تھے کہ یہ مباحات کا دائرہ ہے جس میں ہم اپنے لحاظ سے قانون بنائیں گے بھی اور اس کو واپس بھی لیں گے۔ شریعت قانون سازی کے معاملے میں، محدود دائرے میں یہ کام اس لیے کرتی ہے تاکہ آنے والے تمدن اور تبدیلیوں میں کوئی بڑا مسئلہ پیدا نہ ہونے پائے۔ اور ایک بڑے حصے کو انسانوں پر اس لیے چھوڑ دیتی ہے کہ اگر وہ اس معاملے میں کوئی قانون بنائیں گے تو اس کی غلطی تجربے سے واضح ہو جائے گی اور وہ اس کو تبدیل کر لیں گے۔ لیکن اس دائرے کے بارے میں بھی یہ خیال ہو گیا کہ یہ غالباً کوئی ممنوعات کا دائرہ ہے۔ چنانچہ اس کی ایک بدترین مثال ہمارے سامنے شاہ بانو کیس میں سامنے آئی ہے کہ جب یہ کہا گیا کہ شریعت یہ حق نہیں دیتی۔ دراں حالانکہ شریعت کچھ حقوق دینے کے بعد ہمیں آزاد چھوڑ دیتی ہے کہ اس میں باقی حقوق کی رعایت کر کے ہم حالات کے لحاظ سے خود فیصلے کر سکتے ہیں۔ اس نازک دائرے کو بھی متعین کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس سے بھی انسان کے قانون سازی کے حق پر ایسی پابندیاں لگی ہیں جو مسائل کا باعث بن گئی ہیں۔ وہ بہت سے معاملات جن میں ہم عورتوں کو، بچوں کو، غیر مسلموں کو بہت ساری رعایت دے سکتے تھے، اس کا دروازہ بند ہو گیا۔

تیسری بات مرزا صاحب نے یہ کہی ہے کہ فقہ جدید کیسے بنے گی؟ اس کو مرزا صاحب نے سوالیہ نشان لگا کر چھوڑ دیا ہے۔ میرے نزدیک اب دین کے علما کا کام اس سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ شریعت کی تعبیر کا فرض انجام دیں۔ یہ ان کے اختصاص کا شعبہ ہے، اور پھر اس کے بعد دوسرے انسانوں کو قائل کریں کہ انھوں نے جو تعبیر کی ہے،

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

وہ واقعی صحیح تعبیر ہے اور اس کے دلائل بیان کریں۔ اس سے اوپر فقہ بنانے یا سادہ لفظوں میں یہ کہیے کہ معیشت کے، معاشرت کے گوناگوں احوال میں ایک نظام کھڑا کرنے کا کام ہم کو کرنا ہے۔ جسارت نہ ہو تو عرض کروں کہ علم مسلمان کی میراث ہے۔ جس طرح سے سائنسی علوم میں مغرب بہت سا کام کر چکا ہے، اسی طرح بہت سی جدید فقہ بھی بنا چکا ہے اور کوئی حرج نہیں کہ اس کو قبول کر کے آگے بڑھنے کا فیصلہ کر لیجیے۔ اس میں ساری چیزیں ایسی نہیں ہیں کہ جن سے آپ صرف نظر کریں۔ اس کا نوے فی صد حصہ انسانی مشاہدات و تجربات کے نتیجے میں ترتیب پایا ہے اور میں آپ سے عرض کروں کہ عملاً آپ اس نوے فی صد حصے کو قبول کر چکے ہیں۔ لہٰذا دور جدید میں کچھ کام ہو چکا اور جو باقی رہ گیا ہے، وہ اصل میں سماجی علوم کے ماہرین کو کرنا ہے۔ ہم اعتراف کر لیں کہ ہمارے علما کے لیے اب یہ اختصاص کا میدان نہیں رہا۔ اس میں سماجی علوم کے ماہرین کو آگے بڑھنا بھی ہے اور فروغ علم کی جدوجہد میں سماجی علوم کی اہمیت کو تسلیم بھی کرانا ہے۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ جس طریقے سے آپ سائنسی علوم کے بارے میں فراخ دلی پیدا کر رہے ہیں اور اس میں یہ بحث نہیں کرتے کہ یہ مغرب سے آئے ہیں یا مشرق سے، اسی طرح سماجی علوم کے معاملے میں بھی یہی فراخ دلی پیدا کریں اور جو کچھ ہے، اس کو مومن کی گم شدہ حکمت سمجھ کر قبول کریں۔ معاملہ ایسے نہیں چل سکتا کہ آپ گلیلیو کے دور میں چلے جائیں اور وہاں سے سائنس کی ابتدا کریں۔ آپ کو آئن اسٹائن سے آگے بڑھنا ہوگا اور سماجی علوم کے معاملے میں بھی یہی روش اختیار کرنا ہوگی۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس کوئی راستہ نہیں ہے اور اسی راستہ کو اختیار کرنے میں ہماری نجات ہے۔

یہ چند مختصر گزارشات تھیں جو میں مرزا صاحب کی کتاب کے بارے میں پیش کرنا چاہتا تھا۔ اس میں اگر کوئی چیز اچھی ہے، اسے قبول کیجیے، اگر کوئی بات گراں گزری ہو تو اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

افادات غامدی

اخذ وتحریر: معظم صفدر

نظر ثانی: منظور الحسن

[جناب جاوید احمد صاحب غامدی اپنے ہفتہ وار درس قرآن وحدیث کے بعد شرکا کے سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ ان میں سے چند منتخب سوال وجواب تحریر میں منتقل کر کے پیش کیے جا رہے ہیں۔]

مسنون دعائیں

www.javedahmadghamidi.com

سوال: ہمارے ہاں بچوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مسنون دعائیں عربی زبان میں سکھائی جاتی ہیں۔ نبی کریم نے مختلف موقعوں پر جو دعائیں کی ہیں، کیا وہ صرف ان خاص موقعوں کے لیے تھیں یا اب بھی خیر وبرکت کے پہلو سے دہرائی جا سکتی ہیں اور کیا اس پہلو سے اپنے بچوں کو لازماً یاد کرائی جانی چاہییں؟

جواب: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب دعائیں، بلاشبہ بہت پاکیزہ دعائیں ہیں، لیکن یہ واضح رہے کہ یہ کوئی منتر نہیں ہیں، بلکہ ان کی حیثیت بھی اللہ کے حضور میں درخواست کی ہے۔ البتہ، یہ دعائیں جن روایات میں نقل ہوئی ہیں، ان میں چونکہ زیادہ تر آپ ہی کے الفاظ روایت کیے گئے ہیں، اس لیے اس پہلو سے یہ دعائیں بے پناہ اہمیت کی حامل ہیں۔ مزید یہ کہ ان میں چونکہ اللہ سے مانگنے کے صحیح طریقے کی رہنمائی اور توحید کا صحیح شعور ہے، اس لیے ہم انھیں سیکھتے اور اپنے بچوں کو سکھاتے ہیں۔ لیکن اگر یہ سوچ کر ہم انھیں سیکھیں اور اپنے بچوں کو سکھائیں کہ فقط نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ادا کردہ الفاظ دہرانے یا عربی زبان میں دعا مانگنے سے دعا فوراً قبول ہو جائے گی تو ایسا نہیں ہے۔ دعاؤں کی قبولیت کا اللہ کا ایک ضابطہ ہے، اس لیے دعائیں اس کی حکمت کے تحت ہی قبول ہوتی ہیں۔ وہ عربی زبان میں ہونے سے کوئی مختلف چیز نہیں بن جاتیں۔

معافی اور تلافی

سوال: اگر کوئی مظلوم بے بسی کی وجہ سے اپنا بدلہ روز قیامت پر ڈال دے اور ظالم بعد میں کبھی اللہ کے حضور میں سچی توبہ کر لے تو کیا اس صورت میں ظلم کرنے والے کے ایسے گناہ بھی معاف ہو جائیں گے جن میں دوسرے لوگوں پر ظلم ہوا ہو، کیونکہ اس صورت میں مظلوم قیامت کے دن بھی اپنا بدلہ نہیں لے پائے گا؟

جواب: ایسے گناہوں کے معاملے میں ظالم کے سامنے دو فریق ہوتے ہیں: ایک اللہ اور دوسرا مظلوم۔ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنے کی صورت میں اس کا امکان ہے کہ اللہ معاف فرما دیں گے، کیونکہ وہ بہت غفور و رحیم ہیں۔ لیکن دوسرے فریق، یعنی بندے کا معاف کرنا بھی ضروری ہے۔ قیامت کے دن وہ اپنا مقدمہ لے کر کھڑا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ایسے معاملات میں اللہ سے معافی مانگنے کے ساتھ مظلوم کی تلافی بھی ضروری ہے۔ تلافی کے بغیر معافی بے معنی چیز ہے۔ مراد یہ ہے کہ اگر کسی نے ظلم کیا ہے تو اسے مظلوم سے معذرت کرنا ہو گی، اگر کسی نے زیادتی کی ہے تو اسے مظلوم سے معافی کی درخواست کرنا ہو گی۔ یہ چیز عقل عام اور دین و اخلاق کے خلاف ہے کہ کسی کا حق مار کر اس پر قابض بھی رہیں اور ساتھ اللہ سے سچی توبہ کی دعائیں بھی کرتے رہیں۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے آپ ایک بیوہ کا مکان ہتھیا لیں اور کہیں کہ میں رہوں گا تو اس میں، لیکن سچے دل سے اللہ کے حضور معافی مانگتا ہوں۔ یہ چیز قابل قبول نہیں ہے۔

تاہم، کسی معاملے میں اگر تلافی کی صورت ہی باقی نہ رہے، مثال کے طور پر مظلوم دنیا سے رخصت ہو گیا ہے تو اس صورت میں اللہ سے معافی مانگتے رہنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت میں معافی کی سفارش کر دیں اور وہ خدا کا بندہ اس وقت ظالم کو معاف کر دے۔

خاتون کا نکاح پڑھانا

سوال: کیا کوئی خاتون نکاح پڑھا سکتی ہے؟

جواب: جی بالکل پڑھا سکتی ہے۔ نکاح، اصل میں مرد و عورت کے درمیان علانیہ ایجاب و قبول کے ساتھ مستقل

رفاقت کا عہد ہے۔ ایک لڑکا اور لڑکی اگر مجمع عام میں بیٹھ کر یہ اعلان کر دیتے ہیں کہ آج سے ہم بیاہے گئے ہیں تو بس بیاہے گئے۔ اس سے زیادہ اسلام میں قانون کا تقاضا نہیں ہے۔ لیکن یہ ایک بڑی پاکیزہ مجلس ہوتی ہے، اس لیے اس کو خصوصی حیثیت دی گئی ہے۔ اس میں اس چیز کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ والدین شریک ہوں، اعزہ واقربا شامل ہوں، دوست احباب بھی آ جائیں تو انھی میں سے کوئی بزرگ اس موقع پر تذکیر ونصیحت کی باتیں بھی کر دے۔ یہی عمل ہے جس کو نکاح پڑھانا کہتے ہیں۔ یہ جس کا جی چاہے پڑھا لے۔ خاتون پڑھانا چاہتی ہے، پڑھا لے، مرد پڑھانا چاہتا ہے، پڑھا لے۔ اسلام نے اس کے لیے کسی چیز کا پابند نہیں کیا۔ یہ ایک مستحب اور اچھا عمل ہے۔ لیکن ہمارے ہاں نکاح پڑھانا اب ایسے ہی بن گیا ہے، جیسے کوئی منتر کرنا ہوتا ہے۔

نماز کی قبولیت

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

سوال: کس فرقے کے امام کی اقتدا میں نماز نہیں ہوتی؟

جواب: ہر مسلمان امام کی اقتدا میں نماز ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز آپ کی ہوتی ہے، یہ کسی فرقے کی نہیں ہوتی۔ اس لیے مسلمانوں کے نظم اجتماعی میں جہاں بھی موقع ملے، نماز ہو رہی ہو، آپ اطمینان کے ساتھ نماز پڑھیے۔ امام خواہ سنی ہو یا شیعہ، اہل حدیث ہو یا دیوبندی، اس سے آپ کی نماز کی قبولیت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ یہ ایسی ہی بات ہے کہ اگر امام کا وضو نہیں ہے تو اس کی نماز نہیں ہوئی، آپ کا وضو ہے تو آپ کی ہو گئی ہے۔

کبیرہ گناہوں کی معافی

سوال: سنگین گناہ کی معافی کب تک مانگنی چاہیے، کیا کبیرہ گناہوں کی معافی تمام عمر مانگتے رہنا چاہیے، اور یہ کب اور کیسے معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا ہے؟

جواب: اپنے کبیرہ گناہوں کی معافی تمام عمر مانگتے رہنا چاہیے۔ نہ صرف معافی مانگتے رہنا چاہیے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ تلافی کرنے کی کوشش بھی کرتے رہنا چاہیے۔ گناہوں کی معافی کے لیے ریاضتیں یا چلے درکار نہیں ہیں، فقط سچے دل سے اللہ تعالیٰ سے معافی کا خواست گار ہونا کافی ہے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے نماز کی صورت میں

نہایت اچھا اہتمام کر دیا ہے۔ ہر نماز کے آخر پر دعا و مناجات کے ذریعے سے گناہوں پر توبہ کی جا سکتی ہے۔ مزید یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابۂ کرام سے منسوب اذکار سے دعا مانگنے کا سلیقہ سیکھا جا سکتا ہے، کیونکہ ان میں سب گناہوں کی معافی کے لیے نہایت جامع کلمات ہیں۔

لا علاج مریض کی مصنوعی زندگی

سوال: کسی مریض کے بارے میں اگر یہ اندازہ ہو جائے کہ اس کا علاج ناممکن ہے، تو اس صورت میں ہماری شریعت ہمیں کیا رہنمائی دیتی ہے؟ کیا جب تک اس کی طبعی موت واقع نہ ہو، اسے مصنوعی آلات کے ذریعے سے زندہ رکھا جائے یا دواؤں کے ذریعے سے ازخود موت کے حوالے کر دیا جائے؟

جواب: مرض کا علاج اگر نہیں ہے تو ڈاکٹر پر مریض کو مصنوعی طور پر زندہ رکھنے کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ اگر مریض کے علاج کے لیے آپ کے پاس کوئی چیز موجود ہے تو ہر صورت میں علاج کیجیے ورنہ اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیجیے۔ دین و اخلاق کی رو سے ڈاکٹر کے پاس نہ لا علاج مریض کو خواہ مخواہ زندہ رکھنے کی تدبیر کی کوئی ذمہ داری ہے اور نہ خود سے اقدام کر کے اس کو مارنے کا حق ہے۔ ہمارے ہاں دونوں معاملات میں بالعموم افراط و تفریط ہوتی ہے۔ ایک طرف دواؤں کے ذریعے سے ازخود لوگوں کو مارا جاتا ہے، اس کا بھی کسی کو حق حاصل نہیں ہے، یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ نے کرنا ہے اور دوسری طرف یہ معلوم ہونے کے باوجود کہ کوئی علاج نہیں ہو سکتا، مریض کو زندہ رکھنے کی کوششیں شروع کر دی جاتی ہیں۔ یہ بھی کوئی اخلاقی فریضہ نہیں ہے۔ دونوں کام اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیجیے۔ علاج ہے تو آخری دم تک علاج کیجیے۔ نہیں ہے تو بس ہاتھ اٹھا دیجیے، باقی معاملات اللہ تعالیٰ خود کر لیں گے۔ اس معاملے میں لواحقین کو بھی اصرار نہیں کرنا چاہیے، بلکہ صبر کرنا چاہیے۔

قرآن کی ۳۰ پاروں میں تقسیم

سوال: قرآن مجید کی ۳۰ پاروں میں تقسیم کی کیا حقیقت ہے؟ کیا اس تقسیم کو ملحوظ رکھ کر پڑھنا لازم ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو سورتوں میں تقسیم کیا ہے۔ پاروں میں تقسیم تو بہت بعد میں ہوئی ہے۔ جب

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

تراویح میں لوگوں نے قرآن سننا سنانا شروع کیا اور یہ ذوق پیدا ہوا کہ ماہ رمضان میں قرآن ضرور ختم کرنا ہے تو پھر انھوں نے اسے تیس دن کے لحاظ سے تیس پاروں میں تقسیم کر دیا۔

ہمارے ہاں پہلے زمانے میں حافظ وہ ہوتے تھے جو قرآن کے عالم ہوتے تھے۔ دوسرے زمانے میں حافظ وہ ہوتے تھے جو بالعموم اندھے ہوتے تھے۔ انھوں نے اپنی آسانی کے لیے یہ تقسیم اس طریقے سے کی ہے کہ لفظ گن لیے اور الفاظ کی گنتی کے لحاظ سے قرآن کو تیس پاروں میں تقسیم کر لیا۔ اس تقسیم میں اگر جملہ پورا ہو گیا تب بھی ٹھیک ہے، نہیں پورا ہوا تب بھی ٹھیک ہے۔ کلام کا ربط باقی رہا ہے تب بھی ٹھیک ہے، اور اگر نہیں باقی رہا تب بھی ٹھیک ہے۔

میرے نزدیک یہ تقسیم درست نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی تقسیم سورتوں میں کی ہے اور اسی کے لحاظ سے وہ ہمیشہ پڑھا جانا اور شائع ہونا چاہیے۔ پارے بالکل بے معنی ہیں۔ ان کا کوئی تعلق اس سے نہیں ہے کہ مفہوم و مدعا کے لحاظ سے جملہ کہاں پورا ہوتا ہے۔ اس میں بعض لوگوں نے رکوع کے لحاظ سے مزید تقسیم کی ہوئی ہے۔ اگرچہ یہ کسی حد تک بامعنی اور معقول ہے، لیکن اس پر بھی نظر ثانی ہونی چاہیے۔

سابقہ شریعتوں میں اجتماعی نماز

سوال: اجتماعی نماز کیا ہماری شریعت ہی میں خاص ہے یا پہلی شریعتوں میں بھی رائج تھی؟ حضرت مسیح علیہ السلام کا اپنے شاگردوں سے کہنا کہ تم یہاں ٹھیرو میں اپنی نماز پڑھ لوں، اس سے کیا مراد ہے؟

جواب: پہلی شریعتوں میں انفرادی اور اجتماعی، دونوں نمازوں کا ذکر ہے۔ جیسے ہمارے ہاں اجتماعی نماز بھی ہوتی ہے اور انفرادی نماز بھی ہوتی ہے۔ ہم اجتماعی نماز پڑھتے ہیں اور اس سے قبل یا بعد انفرادی طور پر نفل پڑھتے ہیں۔ تہجد کی نماز تو خاص طور پر انفرادی نماز ہے۔ یہود و نصاریٰ کے ہاں دونوں نمازوں کا ذکر ہے۔ مثال کے طور پر کتاب مقدس میں اس طرح کی باتیں بھی درج ہیں کہ یہ جگہ وہ تھی جہاں جمع ہو کر نماز پڑھی جاتی تھی یا تب لوگ ہیکل کے پھاٹکوں میں نماز پڑھنے کے لیے جا رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ اجتماعی نماز کا ذکر ہے۔ جن موقعوں پر یہ بیان ہوا ہے کہ سیدنا مسیح نے کہا کہ تم ٹھہرو میں تھوڑی دیر کے لیے نماز پڑھ لوں تو یہ انفرادی نماز ہے۔ یہ نفل نمازیں ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بھی ایسا ہی ہے، یعنی آپ نے اجتماعی نماز کا اہتمام بھی کیا اور انفرادی نماز کا بھی۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

صدقہ

سوال: صدقہ اور خیرات میں کیا فرق ہے؟ صدقہ دینے کی صحیح صورت کیا ہے؟ کیا صدقہ صرف گوشت یا جانور ذبح کر کے دیا جا سکتا ہے یا صدقے کی نیت سے ضرورت مند کو پیسا بھی دیا جا سکتا ہے؟ بعض لوگ چیل کووں کے لیے چھت پر گوشت پھینک دیتے ہیں، یا آبی جانوروں کے لیے پانی میں ڈال دیتے ہیں، یا چوراہے میں سری رکھ دیتے ہیں، کیا یہ صدقے کی صحیح صورتیں ہیں؟

جواب: قرآن مجید میں صدقے کا لفظ خیرات کے مفہوم میں آیا ہے۔ عربی میں صدقہ، خیرات، زکوٰۃ، یہ سب الفاظ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے معنی میں آتے ہیں۔ ان سے مراد یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں ضرورت مند لوگوں کی مدد کی جائے، خواہ پیسے دیے جائیں یا کپڑے دیے جائیں یا بھوکے کو کھانا کھلایا جائے یا کسی اور شکل میں ان کی ضرورت پوری کر دی جائے۔

اسلام میں اس طرح کے صدقے کا کوئی تصور نہیں ہے کہ کالا بکرا دے دو یا چوراہے میں سری پھینک دو یا چھت پر یا پانی میں گوشت ڈال دو۔ یہ تو ہم پرستی ہے، اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اللہ توفیق دے تو آپ ضرورت مندوں پر خرچ کریں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net